نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیلِ انسانیت

"من ویزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۲۰۶ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من ویزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف ـ معجزہ و کرامت ـ انسان مجبور ہے یا مختار ـ مذہب و عقل ـ طوفان نوح ـ خضر کی حقیقت ـ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ـ یونس اور دہان ماہی ـ حسن یوسف کی داستان ـ قارون ـ سامری ـ علم غیب ـ دعا و توبہ ـ لقمان ـ عالم برزخ ـ یاجوج ماجوج ـ ہاروت ماروت ـ حوض کوثر ـ امام مہدی ـ نور محمدی اور پل صراط ـ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۲۴۴ صفحات ـ کاغذ سفید دبیز۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک سے جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان قدرتِ بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول۔

حُسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہبِ عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

ال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم

کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا

مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمایئے

ٹیلی گرام :- "مشکی قوام ہوڑہ" ٹیلی فون :- "ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ - ہوڑہ

تیز گرمی کا بہترین ساتھی ہے ایسی سخت گرمیوں میں میری
صحت، میری توانائی اس روح افزا سے قائم رہتی ہے
روح افزا نے مجھے سوسائٹی میں مقبول بنانے میں بڑا حصہ
لیا ہے۔ روح افزا آئس کریم میرے باہر کے مہمانوں نے جب
کھائی تو واہ واہ سے پارٹی گونج اٹھی گرمی میں گھر بھر کو
خوش رکھنے کا ایک ذریعہ میرا یہ روح افزا
ہے

ہر جگہ ملتا ہے

رسالہ ہمدرد گرما جس میں گرمی کے موسم کی ہر بیماری
کا علاج درج ہے اردو ہندی اور انگریزی میں مفت منگائیے

ہمدرد دواخانہ لیبارٹریز، دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازی کمپنی)

حج ۱۹۴۹ء کے لئے جہازوں کا انتظام

مغل لائن کے مقبول عام جہازات امسال بھی رمضان المبارک سے پہلے اور بعد عازمین حج کی خدمت کے لئے وقف ہونگے

قبل رمضان جہازوں کی روانگی

رمضان سے قبل خاص رعایتی کرایوں پر حاجیوں کے لئے جہازوں کی روانگی کا انتظام کیا جائے گا۔

نشستیں محفوظ کرائیے

رمضان سے قبل اور رمضان کے بعد بمبئی سے روانہ ہونے والے جہازوں کی نشستیں محفوظ کی جارہی ہیں۔ عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے نام درج کرالیں تاکہ بعد میں انھیں سعادت حج سے محروم نہ ہونا پڑے۔ جہازوں میں جگہ ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں دیجا سکتی۔ البتہ جن حضرات کی نشستیں محفوظ ہوں گی ان کو ٹکٹ پہلے دئے جائیں گے۔

جہازوں کی روانگی کی صحیح تاریخوں اور کرایوں کا اعلان بعد میں ہوگا

حج کا سفر مغل لائن سے کیجئے

نشستیں محفوظ کرانے کے لئے لکھئے:-

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

مینجنگ ایجنٹس

دی مغل لاین لمیٹڈ

۱۶، بنک اسٹریٹ - بمبئی

تار کا پتہ:-

"مغل" بمبئی

مذہبی استفسارات و جوابات

یعنی

"من و یزداں" کا دوسرا حصہ

۲۰ جون تک شایع ہو جائے گا

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیازؔ نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے :-

اصحاب کہف — معجزہ و کرامت — انسان مجبور ہے یا مختار — مذہب و عقل — طوفانِ نوح — خضر کی حقیقت — مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں — یونس اور دہان ماہی — حسن یوسف کی داستان — قارون — سامری — علم غیب — وحی کی حقیقت — دعا و توبہ — لقمان — عالم برزخ — یاجوج ماجوج — ہاروت ماروت — حوض کوثر — امام مہدی — نور محمدی اور پُل صراط — آتش نمرود — علامہ مشرقی اور قبلہ کا رخ — قرآن و حدیث کی زبان کا فرق — دعا و توبہ کی حقیقت — نفس و روح — آدم اور شجر ممنوع — لفظ امی کا صحیح مفہوم — معاد وغیرہ —

ضخامت ۲۴۴ صفحات — کاغذ سفید و دبیز —

قیمت مجلد علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

منیجر نگار لکھنؤ

رعایتی اعلان

(۱) شہوانیات — مکتوبات سوم — مالہ و ماعلیہ
چار روپیہ — چار روپیہ — دو روپیہ

گوہر — مذہب — مجموعۂ استفسار جلد سوم
ایک روپیہ — ایک روپیہ — تین روپیہ

ان کتابوں کی قیمت علاوہ محصول پندرہ روپیہ ہوتی ہے لیکن اگر آپ سب ایک ساتھ طلب فرمایئں گے تو معہ محصول صرف بارہ روپیہ لئے جایئں گے

(۲) ماجد و لین نمبر — رومان و افسانہ کی دُنیا کا بہترین شاہکار
قیمت ڈیڑھ روپیہ

فسانہ نمبر — بہترین فسانوں کا انتخاب — قیمت دو روپیہ

پاکستان نمبر — جو نگار کا جوبلی نمبر بھی ہے — اڈیٹر نگار کے علمی و تاریخی مضامین کا بیش بہا مجموعہ ہے — قیمت تین روپیہ —

یہ تینوں خاص نمبر یکجا طلب کرنے پر معہ محصول پانچ روپیہ میں مل سکتے ہیں

(۳) من و یزداں — شہوانیات — گوہر
سات روپیہ آٹھ آنہ — چار روپیہ — ایک روپیہ

مکتوبات نیاز حصۂ سوم — مالہ و ماعلیہ — قول فیصل
چار روپیہ — دو روپیہ — دو روپیہ

جن کی مجموعی قیمت بیس روپیہ آٹھ آنے ہوتی ہے ایک ساتھ طلب کرنے پر صرف اٹھارہ روپیہ میں معہ محصول۔

(۴) مذہب — ملک خطا کے شہزادے
ایک روپیہ — بارہ آنے

فراست الید — حکمائے قدیم — شہاب
ایک روپیہ — ایک روپیہ آٹھ آنہ — ایک روپیہ آٹھ آنہ

سب یکجا طلب کرنے پر معہ محصول چار روپیہ — منیجر نگار لکھنؤ

نگار

ایڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۵ | فہرست مضامین جون سنہ ۴۹ء | شمارہ ۶

ملاحظات ---------- ۵
آرٹ غالب کی نظر میں --- صبیح احمد کمالی۔ ام۔ اے (علیگ) ۹
آبادی اور جنسی آزادی ------ م - ز ------ ۱۶
بوستان خیال ------ ح - ا ------ ۲۶
ایشیا اور اشتراکیت ---------- ۳۶
دنیا بدل رہی ہے ------ سید وہاج الدین --- ۳۸
یونیورسٹی سے لوٹتے ہوئے --- ایک پروفیسر --- ۴۱
باب الاستفسار ---------- ۴۳
علمی و تاریخی جھلکیاں ---------- ۴۵
یہ بادل او ملاح (نظم) --- پروفیسر شور --- ۴۹
غزل -- پروفیسر شمس شیدائی و ادیب سہارنپوری --- ۵۱
غزل --- درد سعیدی ------ ۵۲
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۳
مرثیہ نگاری اور میر انیس --- ڈاکٹر محمد احسن فاروقی - ۴۹/۵۶ ۵۶/۶۴

ملاحظات

ہندوستان اور کامن ویلتھ

ہر وہ ملک جہاں جمہوری قسم کی حکومت پائی جاتی ہے، اصطلاحاً اسے کامن ویلتھ کہہ سکتے ہیں۔ خود انگلستان میں چارلس اول کے قتل اور چارلس ثانی کی تخت نشینی کے درمیان کا زمانہ کامن ویلتھ کہلاتا ہے، لیکن "برٹش کامن ویلتھ آف نیشنز" زیادہ جدید اصطلاح ہے جس سے مراد "سلطنت برطانیہ" ہے۔

حکومت برطانیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا، یعنی وہ اس قدر وسیع ہے کہ اسکی سلطنت میں اگر کسی جگہ رات ہوتی ہے تو دوسری جگہ دن ہوتا ہے --- برطانیہ کی یہ وسعت محض اس وجہ سے ہے کہ وہ مستعمراتی حکومت ہے، یعنی علاوہ جزیرۂ انگلستان کے اس کے مقبوضات دنیا کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی آزادی سے قبل برٹش کامن ویلتھ کی وسعت کیا تھی:

یوروپ = ۱۲۱۵۰۰ مربع میل   آبادی - ۴ کرور ۸۰ لاکھ

ایشیا = ۱۸۲۴۵۰۰ مربع میل آبادی - ۳۳ کرور ۳۰ لاکھ

افریقا = ۴۶۵۲۰۰۰ مربع میل آبادی - ۵ کرور

امریکہ ۴۱۱۱۸۰۰ مربع میل آبادی - ایک کرور ۱۰ لاکھ

آسٹریلیا اور جزایر پاسفک = ۳۳۰۰۰۰۰ مربع میل آبادی - ۸۰ لاکھ

برٹش کامن ویلتھ منقسم تھی چھ گروپ میں :-

(۱) برطانیہ عظمیٰ اور شمالی آئرلینڈ - (۲) کناڈا، آسٹریلیا، نیوفونڈلینڈ، جنوبی افریقہ، نیوزیلینڈ اور آئرش فری اسٹیٹ

(۳) ہندوستان - (۴) مستعمرات - (۵) یعنی وہ حکومتیں جو برطانیہ کی تولیت میں تھیں۔

(۶) یعنی وہ حکومتیں جن پر برطانیہ کا اقتدار تھا۔

ان چھ گروپ میں سے صرف ایک گروپ ہندوستان کا ختم ہوگیا ہے، باقی سب کم و بیش اپنی اپنی جگہ قایم ہیں۔

آپ کو اس سے برٹش کامن ویلتھ کی نوعیت کا اندازہ ہوسکے گا اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر ہندوستان، کامن ویلتھ سے علحدہ ہوجائے تو کامن ویلتھ کی ۵۴ کرور آبادی صرف ۱۲ کرور رہجاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان بجائے خود بہت بڑی چیز ہے اور اس کا کامن ویلتھ میں شریک رہنا اسکی عظمت کے منافی ہے، لیکن وہ جماعت جو شرکت کامن ویلتھ کی حامی ہے وہ کہتی ہے کہ آج کل کسی ملک کا وسیع ہونا، یا محض آبادی کی کثرت کوئی چیز نہیں ہے، اصل چیز ملک کا صنعتی و اقتصادی حیثیت سے ترقی یافتہ ہوتا ہے اور ہندوستان ان دونوں حیثیتوں سے ابھی بہت پیچھے ہے۔

پھر اگر ہندوستان نے بھی صنعتی ترقی کرنا چاہی (اور یقیناً اس کو اس مسابقت میں حصہ لینا پڑے گا) تو قدرتاً امریکہ وانگلستان وغیرہ کی طرح اس کی خواہش بھی یہی ہوگی کہ وہ اپنی صنعتی پیداوار کے لئے مارکیٹ پیدا کرے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے کثیر فوج رکھے۔ اور چونکہ فوج آجکل نام ہے محض میکانکی قوت کا جس کے لئے صنعتی ترقی پہلی شرط ہے، اسلئے نتیجہ یہ نکلا کہ آجکل دُنیا کا کوئی ملک اپنی حفاظت نہیں کرسکتا، جب تک وہ صنعتی ترقی نہ کرے۔

ہندوستان ابھی ابھی آزاد ہوا ہے اور اس کے خود اندرونی معاملات بھی ابھی رو براہ نہیں ہوئے، اس لئے اس کی موجودہ پوزیشن کسی طرح اس قابل نہیں کہ وہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے کٹ کر یا اُن سے تعلقات خراب کرکے زندہ رہ سکے، اور یہی وہ چیز تھی جس نے ہندوستانی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ برطانوی کامن ویلتھ میں شریک رہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان نے اپنی قسمت روس کے ساتھ کیوں وابستہ نہیں کی تو بھی یہ کہنا درست نہ ہوگا کیونکہ اول تو روس صنعتی ترقی میں ہندوستان کی کوئی مدد نہیں کرسکتا، نہ اس کے یہاں سے مشینیں یہاں آسکتی ہیں اور نہ ماہرینِ فن آسانی سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جغرافی حالات اور ذرایع مواصلات ایسے نہیں کہ ہندوستان و

روس کے درمیان تجارتی تعلقات وسیع ہو سکیں، تیسرے یہ کہ برطانیہ کا تعلق ہندوستان کے ساتھ عرصہ تک رہ چکا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو اتنا سمجھ چکے ہیں کہ آیندہ تعلقات قایم رکھنے میں اُلجھنیں پیدا ہونے کا امکان کم ہے اور چوتھی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کامن ویلتھ میں شریک ہونا گویا امریکن بلاک میں شامل ہونا ہے اور صنعتی ترقی میں امریکہ سے جتنی مدد مل سکتی ہے، ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ پاکستان نے بھی کامن ویلتھ ہی کا ممبر ہونا پسند کیا ہے، اس لئے اندرونِ ملک کے باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لئے ہندوستان کو بھی کامن ویلتھ ہی میں شریک ہونا چاہئے تھا۔

اس میں شک نہیں کہ روس و امریکہ کی جنگ ناگزیر ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہ روس کے اثرات وسطِ یوروپ میں بہت وسیع ہو گئے ہیں اور کمیونسٹ جماعت مغرب کے دوسرے ممالک اور امریکہ میں بھی آہستہ آہستہ پاؤں جماتی جا رہی ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اشتراکی خطرات اٹلانٹک پیکٹ کے بعد یوروپ میں بہت کم ہو گئے ہیں اور روس کسی جارحانہ اقدام کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ایشیا میں البتہ چین کی وجہ سے روس کے توقعات بلند ہوتے جا رہے ہیں اور اگر یہ خبر صحیح ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات میں کشیدگی کا سبب بھی روس ہی کی چالیں ہیں، تو اس کا امکان ہے کہ کسی وقت روس، چین اور افغانستان دونوں طرف سے بڑھ کر ہندوستان کو شکنجہ میں کسنے کی کوشش کرے، لیکن مستقبل قریب میں اس کا امکان بہت ضعیف ہے اور اگر ایسا ہوا تو امریکن بلاک اپنی تمام قوتیں روس کے خلاف استعمال کرے گا اور روس کے لئے ناممکن ہوگا کہ وہ بحرِ ہند یا بحرِ پاسفک میں ناکہ بندی کر کے انگریزی و امریکی ذرائع مواصلت و نقل و حرکت کو بند کر سکے۔ بہرحال ابھی عرصہ تک اس کا کوئی امکان نہیں کہ روس امریکہ سے جنگ کر سکے یا ان ممالک کی مدد کر سکے جنھوں نے کمیونسٹ اصول کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ہندوستان کا کامن ویلتھ میں شریک ہو جانا بہت دانشمندانہ فعل ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی سخت غلطی ہوتی۔

یہ ہے خلاصہ ان تمام کہی ہوئی اور بے کہی ہوئی دلیلوں کا جو شرکت کامن ویلتھ کے جواز میں پیش کی جا سکتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ دلایل بہت وزنی ہیں لیکن اس کی تردید میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ بھی کم وزنی نہیں، مثلاً یہ کہ کامن ویلتھ کا ممبر رہنے کے بعد انگلستان کے بادشاہ کو اپنا بادشاہ نہیں تو کامن ویلتھ کا سردھرا ہونے کی حیثیت سے اپنا سردار ضرور ماننا پڑے گا اور اس طرح اس نظام میں ہندوستان کی حیثیت ایک ڈومی نین سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگی اور اس کا دعوائے خود مختار جمہوریت بالکل بے معنی سی بات ہوگی، دوسرے یہ کہ جب تک ہندوستان شہنشاہیت کے تصور سے بالکل علٰحدہ نہ ہو جائے، نہ وہ صحیح معنے میں جمہوریت بن سکتا ہے اور نہ وہ عوام میں صحیح جمہوریت کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے جو مکمل سوراج یا آزادیٔ کامل کے منافی ہے۔ یہ تو تھا اخلاقی پہلو، اب اقتصادی، صنعتی و سیاسی پہلو کو لیجئے سو اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کو روس کی طرف سے کوئی مدد نہیں مل سکتی اور ہندوستان کی صنعتی و اقتصادی ترقی زیادہ تر انگلستان و امریکہ ہی کا ساتھ دینے پر منحصر ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بغیر کامن ویلتھ میں شریک ہوئے یہ

مقصود حاصل نہ ہو سکتا تھا کیا اینگلو امریکن مدد حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ کامن ویلتھ کا ممبر ضرور بنا جائے۔ اس وقت دُنیا کے متعدد آزاد ممالک ایسے ہیں جو کامن ویلتھ کے ممبر نہیں ہیں لیکن ان کے سیاسی و اقتصادی تعلقات اینگلو امریکن بلاک سے بالکل دوستانہ ہیں۔ پھر کیا ہندوستان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ فرانس، اٹلی، ترکی، سوئٹزرلینڈ، یونان، ہسپانیہ، پرتگال وغیرہ کی طرح کامن ویلتھ کا ممبر بنے بغیر انگلستان و امریکہ کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھ سکتا اور کیا وہ مفاد جو کامن ویلتھ کا ممبر بننے کے بعد اسے حاصل ہوا ہے ایسے معاہدوں کے ذریعہ سے حاصل نہ ہو سکتا تھا جو دو برابر کے آزاد ملکوں کے درمیان کئے جاتے ہیں۔

یہ ہیں وہ اعتراضات جو اس باب میں پنڈت نہرو کی حکومت پر فریق ثانی کی طرف سے کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن انکا جواب دیا جائے یا نہ دیا جائے، اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ہماری موجودہ حکومت "کمیونسٹ خطرہ" سے زیادہ خائف ہے اور اس خطرہ کو اپنے خیال میں شاید اسی طرح دور کر سکتی تھی کہ کامن ویلتھ میں شریک ہو جائے، کیونکہ بصورت دیگر اس کا امکان تھا کہ اگر ہندوستان کمیونسٹ سیلاب کے روکنے کے لئے آئندہ کسی وقت انگلستان کی مدد چاہتا تو وہ کوئی عذر پیش کر دیتا اور پھر ہندوستان کو مجبوراً کامن ویلتھ میں شریک ہونا پڑتا۔

"کمیونزم" کی طرف سے جو "اندیشہ ہائے دور و دراز" حکومت کو پیدا ہو رہے ہیں، وہ اپنی جگہ غلط ہوں یا صحیح لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کمیونزم واقعی کوئی خطرہ ہے تو کیا اس کو کامن ویلتھ کی شرکت سے روکا جا سکتا ہے۔ اگر ہندوستان کی دفاعی قوت جس پر اب ایک ارب کی جگہ ایک ارب ۶۰ کرور صرف کیا جا رہا ہے، اگر خود اندرونی خطرہ کے دور کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی، تو کسی بیرونی امداد سے بھی اس کا سدباب ممکن نہیں۔

ہم اس سے پہلے ظاہر کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ بحالت موجودہ یقیناً کمیونزم ہمارے درد کا علاج نہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جن پہیوں پر حکومت کی گاڑی اس وقت چل رہی ہے، وہ بھی زیادہ عرصہ تک کام دیتے نظر نہیں آتے۔ آگ سے بچنے کی صحیح تدبیر یہ نہیں ہے کہ پانی کا ذخیرہ فراہم کرنے پر اکتفا کی جائے بلکہ ضرورت ہے اس بات کی کہ خود مکان کو اس طرح تعمیر کیا جائے کہ وہ آگ کو قبول نہ کرے اور خس و خاشاک سے اس کو صاف رکھا جائے۔

ہم حکومت کی دشواریوں سے واقف ہیں، ہم جانتے ہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی گری ہوئی عمارت کا ملبہ بھی ابتک صاف نہیں کر چکی ہے، تاہم اس وقت تک جس ذہنیت سے کام لیا جا رہا ہے، وہ یقیناً ایک پاپولر اور غیر مذہبی حکومت کی روایات کے منافی ہے اور قبل اس کے کہ کانگرس جدید تعمیر حکومت کی طرف متوجہ ہو، اسے پوری طرح غور کر لینا چاہئے کہ جس بنیاد پر وہ یہ عمارت قایم کر رہی ہے وہ واقعی مضبوط ہے یا نہیں لیکن اس مضبوطی کا معیار فوج و اسلحہ کو نہیں بلکہ صرف اخلاقی قوت، انسانیت پرستی اور فراخ نظری کو قرار دینا چاہئے، جو مذہب، کلچر اور زبان سب سے بلند ہے۔

آرٹ غالب کی نظر میں

افسوس ہے کہ غالب نے تنقید میں کوئی مستقل کام نہیں کیا۔ تاہم اس کے کلام میں ایسے مبصرانہ نکات ملتے ہیں جہاں تک صرف ایک بڑے نقاد ہی کی رسائی ہو سکتی ہے۔ اگر غالب کے تنقیدی نظریات کو ایک مربوط اور منظم شکل میں لایا جائے تو ہمیں بعض چیزیں ایسی ملیں گی جن کی باہمدگر تطبیق بمشکل ہو سکتی ہے کیونکہ شعر و فن کے بنیادی اصول کے متعلق بعض جگہ غالب نے ایسی رائیں پیش کی ہیں جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تضاد اسے کیوں کہئے؟ خود غالب کو یہ تمنا کب تھی کہ اسے اکیڈمک ماہر تنقید کی حیثیت سے پرکھا جائے؟ اس کے اشعار میں تو اس وسعت و تنوع کا پرتو ہے جسنے اس کے تجربات و مشاہدات کو حکیمانہ عظمت بخشی لیکن ہم فی الحال اس پر بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اس کا تعلق جمالیات سے ہے۔ اس وقت تو ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آرٹ اور آرٹسٹ کے متعلق اس کا نظریہ کیا تھا۔

اس باب میں غالب کے اردو فارسی کلام سے بعض بہت پاکیزہ نکات اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے جس مسئلہ کو ہم لیں گے وہ آرٹسٹ کی شخصیت ہے۔ اس بارے میں غالب کی تشریحات بڑی حد تک ایک اثباتی حیثیت رکھتی ہیں یعنی غالب ہمیں اس سلسلے میں کسی خاص نصب العین کی طرف لیجانا نہیں چاہتا بلکہ تجربات و شواہد پیش کرنیکے بعد خاموش ہو جاتا ہے اور اس کے یہاں ہم کو وہ قطعیت نہیں ملتی جو اقبال کے افکار میں ملتی ہے۔

غالب کے نزدیک آرٹسٹ کا اپنے آپ کو کسی مخصوص مسلک سے وابستہ کر لینا یا اپنی کوششوں کو کسی خاص حلقے تک محدود کر لینا، ترقی کی راہیں مسدود کر دینا ہے۔ غالب کے نزدیک آرٹ حقایق ہستی کی تفسیر کا نام ہے اور مظاہر کی کثرت سے متاثر ہونا دنیا کی متضاد حقیقتوں کا کھوج لگانا انسانی آنکھ کا ہر رنگ میں وا ہو جانے پر قادر ہونا، اس کے نزدیک آرٹسٹ کے لئے ضروری ہے وہ خود گزینی کو آرٹسٹ کے لئے مضرت رساں سمجھتا ہے۔ اُس کے کلام میں "سر دلبراں اور حدیث دیگراں" سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر طبیعت کے انسان سے ملا ہے اور اس نے ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ رکھا ہے، بلکہ اسی اصولی حیثیت سے وہ انسان کی عظمتوں کا جاننے اور سمجھنے والا ہے اور اسی بنا پر وہ انسانیت کے ہر فرد سے محبت اور دلچسپی رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ بعض اوقات اپنے تلخ تجربات کے زیر اثر "شرح ستم ہائے عزیزاں" کا بھی ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس قسم کے تاثرات ایک ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں اور غالب کی فطرت کی کماحقہ نمایندگی نہیں کرتے۔

دل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے والا یہ "رند بے پروا خرام" نہ صرف دوسرے انسانوں سے لگاؤ رکھتا ہے بلکہ

ان کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتا ہے اسنے ایک نعتیہ قصیدہ کی تمہید میں جہاں وہ نشاط گزشتہ کا ذکر کر رہا ہے، شاعری کے پردے میں سوشل زندگی کے مختلف پہلوؤں کا اظہار کس خوبی سے کیا ہے:-

آں بلبلم کہ در چمنستاں بشاخسار — بود آشیانِ من شکنِ طرۂ بہار
آں مطربم کہ ساز نوائے خیالِ من — غیر از کمندِ جاذبۂ دل نداشت تار
ہر غنچہ از دلم بفضائے شگفتگی — فیضِ نسیم و جلوۂ گل داشت پیش کار
ہر جلوہ رازِ من بتقاضائے دلبری — از غنچہ بود محمل نازے بر ہگزار
فکرم بجیب شاہد اندیشہ گلفشاں — کلکم بطرفِ گلشنِ نظارہ لالہ کار
از چشم و دل نہاد مرا بود تاج و تخت — وز رنگ و بو بساط مرا بود پود و تار
بختم بجیب عشرتیاں می فشاند گل — سعیم ز پائے محنتیاں میکشید خار
وقت مرا روانی کوثر در آستیں — بزم مرا طراوت فردوس در کنار
از پردہ ہائے ساز نفسہا اثر فشاں — وز جلوہ ہائے ناز نظرہا کرشمہ بار

ان اشعار کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ ان میں شاعر نے ایک واضح خط فاصل کھینچ کر دل اور حواس کی دنیا میں تفریق قایم کرنے کے بعد دونوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اور یہی تقابل نظری حیثیت سے غالب کے نزدیک آرٹسٹ کی شخصیت کا جزو اعظم ہے۔

آرٹ کے داخلی اور خارجی محرکات کی یہ لطیف ہم آہنگی غالب کے نزدیک آرٹسٹ کا کمال ہے۔ لیکن اسکے فکر و عمل کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ اگرچہ عالم محسوس سے ربط و تعلق آرٹسٹ کے لئے ضروری ہے لیکن اس سے آگے کچھ بلند تر مقامات اور بھی ہیں، یعنی اس کے نزدیک آرٹ کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب آرٹسٹ خود اپنی ہمت عالی کے ہاتھوں بک جاتا ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب عالم آب و گل کے تجلیات محض وہم و فریب نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان کا وجود اور زیادہ محکم اور بدیہی ہو جاتا ہے۔ یہ مقام 'انا' کی تکمیل کا منتہائے کمال ہے اور اسکے اندر حقیقت پرستی اور تصوریت دونوں کے عناصر شامل ہیں۔ پھر ایک آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو فلسفہ اور حکمت پر اس کی برتری کا پہلو یہ ہے کہ یہاں پہونچنے کے بعد آدمی عزم و یقین کی ان قوتوں سے مستفیض ہوتا ہے جن کے حصول کے بعد غالب "قاعدۂ آسمان" کو بھی پلٹ دینے کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔

عملی زندگی میں اس خود شناسی کے اثرات بہت دور رس ہوتے ہیں۔ اپنی عظمتوں سے باخبر ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم دوسروں سے بھی ایسی ہی ژرف نگاہی کی توقع کرتے ہیں مگر چونکہ یہ جوہر عام نہیں ہے اور ہمیں ہر ہر قدم پر شکست امید سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس لئے یہ نامرادی قنوطیت اور مایوسی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

ساری کی ساری دُنیا پستی اور تاریکی کا مسکن معلوم ہوتی ہے اور طبیعت زندگی کی تمام شورشوں سے اکتانے لگتی ہے۔ غالب ان تمام مرحلوں سے گزرا ہے اور اسے ان سب کیفیتوں کا تجربہ حاصل ہے۔ اور ہم اس کے خیال کو واضح کرنے کے لئے خود اس کے ایک مصرع کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں :-

باہمہ در گفت گو بے ہمہ در ماجرا

ہم دیکھتے کہ کبھی کبھی خود شناسی اور خودنگری کے بدولت آرٹسٹ احساس برتری کے ماتحت روش عام سے کچھ الگ تھلگ سا رہنا پسند کرتا ہے۔ دُنیا والوں کی بے بصری اور حق ناشناسی سے وہ غیر مطمئن اور مغموم بھی رہتا ہے لیکن اس کی یہ افسردہ دلی ایک آفاقی رنگ میں رنگی ہوتی ہے اور مخصوص انفرادی بے بسی اور غمگینی سے مختلف اور بلند تر چیز ہے۔ چنانچہ غالب بھی صرف دُنیا والوں کی قدر ناشناسی کا رونا ہی نہیں روتا بلکہ فخر اور مباہات کے ساتھ اپنی عظمتوں کا ذکر کرتا ہے اور ان پر مسرور ہوتا ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

اسی طرح زمانہ کے نامساعد حالات اور آسمان کی گردشیں دوسروں کی طرح اسے بھی غمزدہ بنا دیتی ہیں لیکن اسکی فطری حوصلہ مندیوں کو محو نہیں کر سکتیں، چنانچہ کبھی تو رضا و تسلیم پر کاربند ہوتے ہوئے آسمان سے مصالحت کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

چوں جنبش سپہر بفرمانِ داور است بیداد نبود انچہ با آسماں دہد

اور کبھی مادی عزت وجاہ کی ہر خواہش کو ٹھکرا کر دارالملک معنی کی فرمانروائی پر ناز کرتا ہے۔

نرنجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالب بدارالملک معنی میکنم فرمانروائیہا

مذہب اور اخلاق کے معاملے میں بھی غالب کے اشعار میں ایک بات ایسی ملتی ہے جسے ہم اس کے مخصوص آرٹ سے مربوط کر سکتے ہیں۔ ازروئے اصول وہ ان اداروں اور ہستیوں سے منحرف ہے جو مذہب کو غیر معقول رسم ورواج کا بازیچہ بنا دیتی ہیں۔ وہ ایسے لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار اس طرح کرتا ہے :

سخن کوتہ مرا ہم دل بتقوی مائلست اما زننگ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا

تخلیق ہنر کے لئے ایک خاص مزاج درکار ہوتا ہے، خواہ وہ ماحول و توارث کا کرشمہ ہو یا عطیۂ ربانی کا اسکو غالب اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

حسنِ فروغ شمع سخن دور ہے اسد پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

دل کی گداختگی سے غالب کی مراد کیا ہے ؟ بظاہر یہ عقل و تفکر کی ضد معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ عقل کے ساتھ اس کا اجتماع ممکن ہے اس لئے یہ عقل کی نقیض نہیں بلکہ اس سے بلند تر ایک جوہر ہے۔ اس کی حقیقت کو غالب نے

اس طرح ظاہر کیا ہے :-

رشکِ سخنم چیست نہ شہد ہوس است ایں　　تلخابۂ سرجوشِ گدازِ نفس است ایں

گویا آرٹ کی نشو و نما وہاں ممکن ہے جہاں عقل و ہوش کے لطیف امتزاج سے ایک نئے مرکب کی تشکیل ہوتی ہے - عام گفتگو میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا عنصر غالب عقل کے مقابلہ میں دل ہی کو ٹھہرایا جا سکتا ہے - لیکن در اصل اس میں دونوں شامل ہیں اور دونوں انتہائی ترقی یافتہ صورت میں ہونے کی وجہ سے اپنی اصل سے قطعاً مختلف ہیں اس رنگ طبیعت کا خاصہ کیا ہے ؟ اس کا مفصل جواب غالب نے اپنے ایک قصیدہ کی تمہید میں دیا ہے :-

رہرواں چو گہر آبلۂ پا بینند　　پای را پایہ فراتر ز ثریا بینند

ہرچہ در دیدہ عیانست نگاہش دارند　　ہرچہ در سینہ نہانست ز سیما بینند

راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند　　نقش کج بر ورق شہپر عنقا بینند

دور بینانِ ازل کوری چشم بدبیں　　ہم درینجا نگرند انچہ در آنجا بینند

راہ ازیں دیدہ وراں جوی کہ از دیدوری　　نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند

راہ ازیں دیدہ وراں پرس کہ در گرمروی　　جادہ چوں نبض تپاں در تن صحرا بینند

شام در کوکبۂ صبح نمایاں نگرند　　روز در منظر خفاش ہویدا بینند

ہرچہ گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند　　ہرچہ آرد عرب از وامق و عذرا بینند

قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند　　بادہ را شمع طربخانۂ ترسا بینند

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب　　خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلا بینند

دل نہ بندند بہ نیرنگ و دریں دیر دو رنگ　　ہرچہ بینند بعنوان تماشا بینند

برد از یاد کہ دنیاست نمودے بے بود　　ایں دل افروز نمودے کہ ز دنیا بینند

آرٹ کے آفاقی آئین کا اس سے بہتر اعلان ہم کہیں اور کم پائیں گے - ان اشعار کا تجزیہ کیجئے اور دیکھئے کہ انکی پہونچ کہاں تک ہے - پہلی چیز جس پر نظر پڑتی ہے وہ اسپرٹ ہے جو تمام کائنات کو اپنی جولانگاہ سمجھتی ہے - دنیا کی ہر چیز اپنے اندر ایک دلفریبی اور کشش لئے ہوئے ہے - وجود کا ہر اک منظر اور حیات کا ہر اک رخ آرٹ کا موضوع ہے - ہر وہ چیز جو موجود ہے اپنی جگہ پر موزوں اور برحق ہے - آرٹ صرف اخلاق کا پیغامبر نہیں ہوتا - اس کے مشاہدات میں خیر و شر، حق و باطل اور زشت و نکو سب کو جگہ حاصل ہے :-

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

آرٹ محض اشیا کے مشاہدے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنے اندر تخلیقی قوتیں رکھنے کی وجہ سے وہ مشاہدات آب و گل

میں ایک وحدت و تنظیم بھی پیدا کرتا ہے، وہ صورت کے ساتھ ساتھ معنی کی جستجو میں بھی منہمک رہتا ہے اور فطرت کے دستور عمل کا سراغ بھی لگاتا ہے۔ وہ زندگی کا مفسر نہیں، بلکہ محاسب ہے۔

باریک بین قاعدۂ بت تراشیم　　　　در ہر تراش خردہ بر آذر گرفتہ ایم

تیسرا نکتہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق فن کے لئے ضروری ہے کہ صاحب فن کے تمام ارتسامات آزاد اور غیر ملوث ہوں۔ اس کے نفس کی اثر پذیری اس درجہ تک پہونچ چکی ہو کہ ماحول کی ادنیٰ سے ادنیٰ جنبش اس کے اندر ہیجان و اضطراب پیدا کر دے لیکن ان سب کے باوجود اسکی ذہنی ساخت اس قسم کی ہونی چاہئے کہ خارجی تحریکات سے اثر لینے کے ساتھ ساتھ اس کی انفرادیت یا اس کی خودی پر آنچ نہ آنے پائے۔ درحقیقت یہی مقام تخلیق فن کے سلسلے میں سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ ایک طرف گمراہ کن غیر مادی اعیان کا طلسم آرٹ کے اندر زندگی کی حرارت کے لئے خطرات پیش کرتا ہے دوسری طرف بتخانۂ حوادث کے اصنام اس کو ہر تعمیری قوت سے محروم کر دینے کے درپے ہوتے ہیں۔ اس فتنے سے صحیح و سالم وہی بچکر نکلتا ہے جو ان دونوں گزرگاہوں کے نشیب و فراز سے بچ کر بیچ کی راہ اختیار کرتا ہے۔ جو اپنے آپ کو ہر آنے والی چیز کے ہاتھوں سونپ نہیں دیتا بلکہ ہر کسی کے لئے آغوشِ شوق کھولدیتا ہے:۔

دیدہ در آنکہ تا نہد دل بشمارِ دلبری　　　　در کفِ خاک بنگرد رقصِ بتانِ آذری

یہ ہیں چند خصوصیات اس افتادِ مزاج کی جس کی بدولت آدمی حسن و جمال کے نگارخانے میں بار پاتا ہے اور ان خصوصیات کو مشرق میں محبت و غم سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن غم سے مراد یاس و قنوط نہیں، بلکہ احساس محبت کی وہ آفاقی صورت جو تمام عالم ہستی پر محیط ہے

نہال شمع را بالیدن از کاہیدن است اینجا　　　　گداز جوہر ہستی ست غالب آبیار ما

مایوسی اور نامرادی محبت و غم کا لازمی نتیجہ نہیں، اسی لئے غالب کے یہاں شخصی حزن و ملال کا اظہار ہر جگہ اور ہر وقت ایک زبردست اپیل رکھتا ہے وہ کہتا ہے:۔

مگر مرا دل کافر بود شب میلاد　　　　کہ ظلمتش دہد از مرگ اہل عصیاں یاد

بطالعے ز عدم آمدم بباغ وجود　　　　کہ رفتہ بود بدروازۂ ارم شداد

خروش مرگ کہ طوفان نا امیدیہاست　　　　عزیہ یاس کہ مرگے بہ تو مبارکباد

طلوع نشاۃ بیم ہلاک طالع وقت　　　　ہجوم عرض بلاہائے تازہ عرض بلاد

جہیم ناظر و خشم خدائے مستولی　　　　سہیم دشمن و ہیلاج دیدۂ حساد

قضا نگارش اسرار شکل زائچہ را　　　　کند زدود دل دردمند اخذ مداد

مگوی زائچہ کایں نسخہ ایست از اسقام　　　　مگوی زائچہ کایں جامعیست از اضداد

غالب کے یہاں ایک طرف نہ صرف بہ اعتبار صورت قدیم اساتذہ کے تتبع اور فارسی ادب کی میراث سے فائدہ اُٹھانے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کی شاعری ابہام و رمزیت سے خالی ہے، اس لئے ہم اسے کلاسکل شاعر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس کا طبعی جوش و خروش اس کی معنی آفرینیاں اسے رومانٹک اسکول کے سربرآوردہ شعراء کے دوش بدوش لے آتی ہیں۔ مشرقی روایات کو نظر میں رکھئے تو ان لوگوں کا خیال بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا جو غالب کا مقابلہ انگلستان کے مابعد الطبیعی شعراء سے کرتے ہیں ـــــــــ

البتہ جرمن شاعر گوئٹے کو غالب کا ہم نوا بتانا زیادہ قرینِ عقل بات ہے۔ غالب کی طرح گوئٹے کے سامنے بھی قدیم یونانی آرٹ کی روایات ایک زندۂ جاوید الہامی قوت کی حیثیت سے موجود تھیں اور جس طرح غالب نے اپنے آپ کو "میراثِ خونیں نفساں" کا اہل ثابت کیا، گوئٹے نے بھی اپنے آرٹ کی بنا انھیں روایات پر قایم کی۔ اسی کے ساتھ دونوں نے ایک زبردست قوت فکر و نظر کا مالک ہونے کی حیثیت سے اپنے اپنے روایتی اثرات کو اپنی شخصیت کے رنگ میں رنگ دیا اور ان پر اپنی ذاتی فطانت کی مہر ثبت کی۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کو ہم کلاسکل اسپرٹ رکھنے کے باوجود رومانٹک اسکول کے اماموں میں شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن خود غالب اپنے آپ کو غالباً محض رومانٹک شاعر کہلانا ہی پسند کرے گا۔ کہتا ہے:-

دریاب مذاقم ز کلامم کہ نباشد — مینائے مرا پنبہ بغیر از کف صہبا

نال قلم از جوشش گداز دل خویشم — سیراب بود ہمچو رگ ابر ز دریا

رخشانی معنی دمد از پردۂ لفظم — چو شمع ز فانوس و مئے لعل ز مینا

میراث رسیداست ز خونیں نفسانم — داغے شرر انداز و بیانے جگر آلا

یابی تہ خاکسترِ ہر حرف شرارے — آتشکدہ کاواست دمم پارسیاں را

آنم کہ بافزائشِ اندازۂ فطرت — آنم کہ بآرائش انداز تماشا

نطقم ز دم انگیختہ از مغز خرد جوش — کلکم ز رقم ریختہ بر صفحہ ثریا

اس نظم میں جس خیال کو مرکزی اہمیت حاصل ہے وہی شاید رومانٹک نظریہ کا سنگ بنیاد ہے۔ غالب شاعری کی نوعیت کو وہبی اور الہامی قرار دیتا ہے۔ یعنی کوئی نامعلوم ہاتھ مضراب کو جنبش میں لاتا ہے جس سے "تارِ رگِ جان" پر چوٹ پڑتی ہے اور نغمے بیساختہ فضا میں بکھر جاتے ہیں۔ پھر خرد اور تمیز کی تنگ دامنی اس سے آگے یوں بھی آشکارا ہوتی ہے کہ زبان جو انسانی شعور کا سرمایہ ہے، روح کی کیفیات گداز کے اظہار سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ غالب نے اس مضمون کو بالتکرار بہت واضح طریقے سے بیان کیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس نے ایک بہت گہری نفسیاتی حقیقت کو ظاہر کیا ہے جسے بیسویں صدی میں فرانسیسی حکیم ہنری برگساں نے

اپنے نظام فکر میں ایک مخصوص جگہ دی ہے۔ برگساں نے بھی اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ خیالات اظہار کے بعد زمانی و مکانی علایق سے جکڑ جاتے ہیں اور ان میں ابدیت کا عنصر اور نشو و نما کا وہ تسلسل باقی نہیں رہتا جو نہاں خانۂ دل میں موجود ہے۔

آخری سوال جس سے ہمیں بحث کرنا ہے غالب کی نظر میں آرٹسٹ کا نصب العین ہے۔ اس گفتگو کے سلسلہ میں شاید اس دعوے کی بھی مزید وضاحت ہو جائے گی کہ غالب کا نظریۂ فن از روے سرشت رومانٹک ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر آرٹسٹ کو رومانٹک یا کلاسکل دونوں نام دئے جا سکتے ہیں، لیکن جیسا اوپر کہا گیا ہر آرٹسٹ کی طبیعت میں مختلف اجزاء کے پائے جانے کے باوجود ان میں سے کسی ایک کا الہامی قوت ہونے کی حیثیت سے سب پر فوقیت رکھنا ضروری ہے۔ رومانٹک اور کلاسکل اسرار ہستی کی جستجو کے جدا جدا طریقے ہیں۔ کلاسکل نقطۂ نگاہ میں خارجی اشیاء بجائے خود اور برائے خود تحریک نفس کا ذریعہ ہوتی ہیں اور آدمی کو اپنی توجہ ان چیزوں پر منعطف کرنا ہوتی ہے جو بلا واسطہ حواس کی دسترس میں ہیں۔ اسی وجہ سے کلاسکل ادب میں ہر نقش بھرپور واضح اور ستھرا ہوتا ہے، اور اس کی نمایاں خصوصیات، نفاست اور ضبط و نظم ہیں۔ اس کے برعکس رومانٹک طبیعت تخئیل کی تعمیری قوتوں سے تعلق رکھتی ہے۔

اس فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس کے مقام کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ اسنے لکھا ہے

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار — زیک جام اند در بزم سخن مست
و لے با بادۂ بعضے حریفاں — خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کچھ ماورائی صداقتوں کا بھی قایل ہے اور انھیں کی طلب کو وہ آرٹ کا نصب العین قرار دیتا ہے۔ اسے یہ احساس ہے کہ جستجو کے ان مراحل میں طبیعی حقایق کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے جس پر آسانی سے رضامند نہیں ہوتا، لیکن چونکہ ارتقاء فن کے لئے یہ قربانی لازمی ہے لہذا وہ اپنے دل پر پتھر رکھ لیتا ہے:-

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

اور یہی وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا ہے:-

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہو کیا — حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

صبیح احمد کمالی - ام - اے علیگ

اطلاع:- جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

مینجر نگار

آبادی اور جنسی آزادی

سرجان بائڈ اور (Sir John Boydorr) ایک مشہور ماہر غذائیات ہیں اور بین الاقوامی مجلس غذا کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ موصوف نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ دُنیا کی آبادی اگر موجودہ رفتار سے بڑھتی رہی تو انسانیت کے لئے ایٹم بم سے زیادہ مہلک ثابت ہوگی۔

ساری دُنیا خصوصاً مشرقی ممالک کے سامنے یہ مسئلہ بہت اہم ہے، مشرق کا معیار صحت بہت گرا ہوا ہے۔ اور چونکہ صحت کا دماغ سے گہرا تعلق ہے اس لئے اوسطاً فکری اور عملی اعتبار سے مغرب کا عام انسان مشرق کے عام انسانوں سے بلند ہے۔ اس میں سوچنے اور کام کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ لیکن مشرق و مغرب کے اس امتیاز سے قطع نظر دنیا کا معیار صحت اور بلند ہو سکتا ہے تو کیسے؟

آبادی اور صحت دونوں مسئلے ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اس لئے دونوں پر گفتگو ایک ہی عنوان کے تحت ہوگی اور خصوصاً ہندوستان کی آبادی اور صحت کے پیش نظر۔ گرچہ پنڈت نہرو کو غالباً یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ ہندوستان کی آبادی وسائل معاش کی نسبت زیادہ ہے لیکن عوام کے معیار صحت اور معیار زندگی کا اشارہ کسی اور جانب ہے۔ اور اگر ایک لمحہ کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہندوستان میں ابھی کثیر انسانوں کی گنجائش ہے، پھر بھی افزائش نسل کی روک تھام کا مسئلہ اپنی جگہ پر قایم رہتا ہے۔

آج سے کچھ دنوں قبل کی بات ہے جب خالد لطیف گابا اور مس میو میں نوک جھونک ہو رہی تھی اور برتھ کنٹرول کا مسئلہ بڑے زور شور سے چھڑا ہوا تھا تو مہاتما گاندھی نے ضبط نفس کی رائے دی۔ مہاتما گاندھی کا ایک خیال یہ بھی ضمناً قابل تذکرہ ہے کہ وہ مرد عورتوں کے جنسی تعلقات کو بُرا سمجھتے تھے اگر اس کا مقصود بچہ پیدا کرنا نہ ہو۔ اگر گاندھی جی کے مشورہ پر عمل کیا جائے تو بلا شبہ دُنیا کی آبادی کم ہو سکتی ہے لیکن اس سے زیادہ یقین کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی نصف آبادی مراق، مالیخولیا، جنون، ہذیان، خبط اور اختناق کے مریضوں کی ہو جائے گی۔ اور باقی نصف کا حشر نہ معلوم کیا ہو۔ ممکن ہے ہمیں فرائڈ کے نظریوں سے اختلاف ہو اور ہم انسانی زندگی میں جنس کو وہ رتبہ نہ دیں جو فرائڈ دیتا آیا ہے لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ جنس انسانی اعمال و افعال کے لئے سب سے قوی اور سب سے توانا محرک ہے۔ دُنیا اب ایڈلر کے اس نظریوں کی کلی صحت پر اعتماد نہیں کر سکتی کہ عہد طفلی کے نصب العین انسانی کردار کی تعمیر

کے لئے کافی ہیں - باوجود اختلافات کے ژونگ اور فرائڈ دونوں اس پر متفق ہیں کہ انسانی کردار فطرت کے بعض بنیادی مطالبات میں جنسی مطالبہ سب سے اہم ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ فرائڈ جنس کے علاوہ اور کسی مطالبہ کی طاقت تسلیم نہیں کرتا لیکن فرائڈ اور ژونگ کے نظرئے دارالعمل کی بھٹی سے گزر چکے ہیں اور ان کے تجربے کم و بیش ان کے نظریوں کی تصدیق کرتے ہیں اعصاب کے سارے نہیں تو معتد بہ مریض جنسی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں - اور ہر نفسیات داں کو اس کا اعتراف ہے کہ جنسی مطالبات پر تکمیل کے دروازے بند کرنا اعصابی امراض کو دعوت دینا ہے - یہ صحیح ہے کہ کچھ دنوں تک جنسی مطالبات کو اعلیٰ نصب العین یا دلچسپ مشغلوں سے فریب دیا جا سکتا ہے لیکن اس فریب کو غیر متعین مدت تک طوالت نہیں دیجا سکتی - ورنہ انسان کی حیلہ جو طبیعت بہت سے بہانے ڈھونڈ لیتی ہے جو اس کی صحت کو بگاڑ دیں اور نصب العین یا فن یا مشغلہ سے عشق ہر شخص کی فطرت نہیں ہوتی، ایسی طبیعتیں شاذ ملتی ہیں - اس لئے ضبط نفس قابل عمل اصول نہیں - یہ کوئی نیا اصول بھی نہیں اور عیسائیوں کے یہاں شادی اس اصول کے ناقابل عمل ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے -

اب رہا برتھ کنٹرول کا مسئلہ تو حکما اس پر متفق ہیں کہ اس کی کوئی شکل ایسی نہیں جو صحت کے لئے کم و بیش مضر نہ ہو - اور پھر بھی کوئی طریقہ ان میں حتمی نہیں - غیر فطری ہونے کے علاوہ یہ طریقہ عام طور پر ہر شخص کو اپیل نہیں کر سکتا، کیونکہ اس طرح سے لذت کم ہو یا نہ ہو یہ احساس کیسے ختم کیا جا سکتا ہے کہ ایک خارجی شے دو افراد کے درمیان حایل ہے - چونکہ انسانی فطرت براہ راست جستجو کی عادی رہی ہے اس لئے وہ کوئی پردہ نہیں کر سکتی - البتہ آپریشن ایک صورت ہے لیکن گراں ہونے کے علاوہ دشوار بھی ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں - پھر آپریشن کا نفسیاتی اثر انسانی طبائع پر اچھا نہیں پڑ سکتا -

آخری صورت وہ ہے جس کی جانب چند سال قبل مدیر نگار کے لکھنوی دوست نے اشارہ کیا تھا یعنی استلذاذ بالمثل اس مسئلہ پر نگار ہی میں کافی گفتگو ہو چکی ہے لیکن اس کا اثر عورتوں کی صحت پر جس درجہ مہلک و مہیب ہوگا اس کا اندازہ دشوار نہیں - خود مردوں کی صحت پر بھی اس کا اثر کم برا نہیں ہوتا - اور پھر اس کے لئے کوئی جمالیاتی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا -

یہ موجودہ تہذیب کی خصوصیت ہے کہ وہ سوال کر سکتی ہے جواب نہیں دے سکتی، وہ شک کر سکتی ہے ایمان نہیں دے سکتی، اس نے ہزاروں حقیقتیں برہنہ کر دی ہیں جن سے ہزاروں سال کا پروردہ ضمیر کانپ رہا ہے لیکن اس نے کوئی ایسا مربوط نظام فکر نہیں دیا جو انسانیت کو شک و تذبذب کی ظلمت سے یقین کی روشنی میں لے آتا - ایک عام انسان مذہب سے برگشتہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کی روایات میں راسخ ہے، وہ حقایق کا منکر نہیں ہو سکتا کہ وہ انکے کرشمے سینما میں ریڈیو میں دیکھتا ہے سنتا ہے - وہ جانتا ہے کہ ان دونوں میں صلح کے امکانات ختم ہو چکے ہیں پھر بھی وہ یہ سوچنا نہیں چاہتا کہ زندگی کے متعلق وہ حقایق کیا ہیں جو مذہب کی بتائی ہوئی حقیقتوں سے متصادم ہیں - وہ ایک ابن الوقت، ایک مکار کی طرح مذہب اور سائنس سے اپنے کام کی باتیں لیکر زندگی کے تانے بانے بن لیتا ہے - کچھ روشن خیال ایک سانس میں مارکس، ڈارون، فرائڈ، آئنسٹین کے نظریات کا سطحی تذکرہ کرتے ہوئے دو جملوں میں ان کو اور اپنی عقل کو فریب دیکر

عوام سے کہتے ہیں کہ تالیاں بجاؤ۔ بعض اہلِ نظر جن کی نگاہیں پردۂ وجود کو چیر گئی ہیں ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ زندگی کے مسایل کو راست بازی سے بیان کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ قدیم و جدید کا یہ لین دین سراسر بددیانتی پر مبنی ہے۔ اور دونوں بے دونوں اس کے یکساں طور پر ملزم ہیں۔ اخلاق مجلسی نے شروع ہی سے قوانین وضع کر دئے ہیں کہ جنسی مسایل پر سیدھے سادے لفظوں میں گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ ہمارے سوال کا جواب منحصر ہے اس بات پر کہ ہم معاشرتی مسایل پر بیباکانہ اظہار خیال کر سکیں۔ میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ غذا اور صحت کے علاوہ معاشرہ کی اور بہت سی خامیاں صرف اس وجہ سے ہیں کہ شادی کی وحشیانہ رسم آج تک جاری ہے۔ شادی کا تصور وراثت کے تصور سے جدا کوئی شے نہیں عہد وحشت کے انسان کی اجتماعی حس بلند نہ تھی وہ ہر چیز کو اپنے اور غیر کے نقطۂ نظر سے سوچتا تھا۔ وہ وجود بالذات کا قایل نہیں تھا، وہ اس کی نسبتیں تلاش کرتا تھا۔ اسی لئے بیوی اور بچے کو وہ اپنی ایسی ہی ملکیت سمجھتا تھا جیسی کھیت کو۔ اور اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ پہاڑ اور دریا کو بھی خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کر لیتا۔ وراثت کا یہ تصور انسانیت کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دُنیا میں جتنی جنگیں لڑی گئی ہیں اور آیندہ لڑی جائیں گی وہ اسی تصور کے سبب۔ فرق یہ ہے کہ پہلے یہ جنگیں باغوں، جھونپڑوں اور کھیتوں کے لئے لڑی گئیں، پھر قبیلہ، ملک و مذہب کے لئے اور آج یہ تصورات زندگی کے لئے لڑی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ لڑنے والوں کا اپنا جھونپڑا، اپنا کھیت، اپنا قبیلہ، اپنا مذہب ہے جسکے لئے یہ لڑتے ہیں، اگر ان چیزوں سے تصور الگ کر لیجئے تو کوئی جنگ ہی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے نصف صدی قبل جب مذہبی مناظرے عام تھے۔ ہر شکست خوردہ فریق اپنے عقیدوں کی حمایت کے لئے نئے نئے دلایل ڈھونڈھتا اور بحث کے نئے اسالیب ایجاد کرتا تھا لیکن جیسے جیسے انسان کی اجتماعی حس بڑھتی گئی اس کے 'اپنی کائنات' کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اور اس نے اپنی مِلک کے تحفظ کے لئے بعض تصورات گڑھے۔ مثلاً بچوں پر حق ملکیت جتانے کے لئے اس نے فرمانبرداری کا تصور ایجاد کیا، عورتوں کے لئے عصمت، کھیت کے لئے وراثت، قومی افتخار، خاندان کی لاج، برادری کی ناک بھی اسی قبیل کے محاورے ہیں۔ عصمت کا تصور جاگیردارانہ نظام زندگی میں اور دو ڈھب سے مضبوط کیا گیا، یعنی پردہ اور کمسنی کی شادیوں سے۔

جاگیردارانہ نظام زندگی کے ارباب حل و عقد نے بڑی دور اندیشی سے کام لیکر محسوس کر لیا کہ عصمت کے تحفظ کے لئے پردہ ضروری ہے۔ بلاشبہ اگر نوجوان مرد اور عورتوں کو ملنے جلنے کے مواقع حاصل ہوتے رہیں تو لغزش کے قوی امکانات ہیں ——— حالانکہ ان دنوں نہ آبادیاں گنجان تھیں نہ گھر کا مرد گھر کی عورت سے یوں الگ رہتا تھا جیسا آجکل کا مزدور اپنی عورت سے۔ اور نہ ان دنوں خاندان مشتمل ہوتا تھا ایک میاں اور بیوی پر۔ اس کے علاوہ بہو کی چال چلن پر اتنی رسمی بندشیں تھیں کہ اس کے منہ سے گھونگھٹ اسی وقت ہٹتا تھا جب وہ از کار رفتہ ہو جائے۔ ان بندشوں کے باوجود پورے خاندان کی نگراں آنکھیں۔ کمسنی کی شادی، عہد نا کتخدائی کی بے راہ روی کے سارے امکانات ختم کر دیتی

تھی۔ پھر بھی پردہ کی قید ضروری سمجھی گئی۔ اور یہ تسلیم کرنے میں کسی صاحب فکر کو تامل نہ ہوگا کہ اگر عصمت واقعی بڑی اہم قدر ہو تو پردہ عورتوں کے لئے ضروری ہے۔

لیکن موجودہ دور میں پردہ حفظ ماتقدم کے لئے قطعاً کافی نہیں۔ کیونکہ اب آبادیاں گنجان ہیں اور زندگی یوں گزرتی ہے کہ ہر باکار انسان عام طور پر دس بجے دن سے پانچ بجے شام تک گھر سے باہر رہتا ہے اور اس کی بیوی دن کا یہ سارا عرصہ تنہا گزارتی ہے۔ اس کی دلچسپی کے لئے جاگیردارانہ نظام زندگی کا وہ ٹھہراؤ اور پھیلاؤ اسے نصیب نہیں جس میں سندیں اس کی دلبستگی پیدا کر سکیں اور پھر دلچسپی کے ہزاروں دیہاتی ڈھکوسلے جھولا، ہنڈ کلیا، گیت، رسمیں موجود ہوں۔ پرانے زمانہ کے مکانوں میں روزن نہیں ہوتے تھے، کھڑکیاں نہیں ہوتی تھیں، زمین وافر تھی، زنانخانہ مردانہ بیٹھک سے دور ہوتا تھا اور ہر زنانخانہ میں وسیع آنگن تھے، ہوا اور دھوپ میسر تھی۔ آج کے شہروں کو چھوڑئے آج کے دیہاتوں میں بھی آبادیاں اتنی گنجان ہیں کہ ہوا، روشنی اور دھوپ کے لئے کھڑکیوں کے بغیر کوئی چارہ نہیں لیکن کھڑکیاں نظارہ بازی کے لئے استعمال کی جا سکتی ہیں، یوں بھی عورتوں کی اُچٹتی نگاہ مردوں پر پڑ سکتی ہے اور چونکہ پردہ کے پس پشت دو تصور کارفرما ہیں ایک تو یہ کہ مرد عورتوں پر حاوی اور ان کے کردار کا نگراں ہے اور دوسرا تصور یہ کہ عورتیں بہت جلد بہک جا سکتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ عورتوں کو تہ خانوں میں بند کیا جائے۔ لیکن اگر عورتوں کی صحت ان کی عصمت سے زیادہ قیمتی ہے تو پھر عصمت کے تحفظ کے لئے تہ خانوں کا استعمال غلط ہوگا۔ ان کی شرافت نفس پر اعتبار کرنا تو سرے سے غلط ہے، کیونکہ کوئی مرد کسی مرد کی شرافت نفس پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا، لیکن ان کی زندگی بچانا بھی ضروری ہے۔

اس کشمکش سے نجات کی تلاش میں ہم ایک خوش عقیدگی سے دوچار ہوتے ہیں، یہ خوش عقیدگی یہ ہے کہ ہم پھر جاگیردارانہ نظام زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔

بدقسمتی سے موجودہ تہذیب کو ہم ایسا سمجھتے ہیں جیسے یہ ہم پر عاید کر دی گئی ہے۔ یہ تہذیب ہم سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں یہ تہذیب زندگی کا جزو مشترک ہے، یہ زمانہ کی ناگزیر پیداوار ہے، حسیات شباب اور علامات شباب عمر کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اگر مونچھیں صاف کر دینے سے کسی نوجوان کی بالیدگی کی رفتار روک دی جا سکتی ہے تو پھر پردہ عاید کر کے ہم قدیم نظام زندگی کی طرف بھی لوٹ سکتے ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں۔ ہر نوجوان اپنے عہد طفلی کو حسرت سے یاد کرتا ہے، ہر نئی تہذیب اپنے ماضی کو اسی حسرت سے یاد کرتی ہے۔ لیکن حال کی تہذیب کا انکار زندگی سے گریز ہے بری ہو یا بھلی یہ تہذیب ہم پر اور ہم اس تہذیب پر مسلط ہیں، اور ہمارا قدامت کی طرف رجعت کرنا ناممکن ہے اور اقتضائے فطرت کے خلاف۔ اگر ہم اپنی ترقی کی راہ میں حایل ہوں گے تو اس کا فایدہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم دوسروں سے پیچھے رہ جائیں۔ گاندھی جی کا شمار اس عہد کے بہت بڑے قدامت پسندوں میں کیا جائے گا۔ لیکن ساری زندگی ان کا قدم جدت کی طرف بڑھتا رہا۔ البتہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ وہ اپنی تحریکوں کے لئے ایک قدیم نصب العین پیش کرتے تھے، وہ تعلیم نسواں، بے پردگی، عقد بیوگان اور

عورتوں کی کامل آزادی کے موید تھے لیکن ان کا مطمح نظر 'عصمت' تھا۔ انھوں نے کانگریس کو ڈیموکریسی سکھائی لیکن خود راستی کے علمبردار رہے۔ مجھے نہ گاندھی جی کے خلوص پر شبہ ہے اور نہ ان کی عظمت سے انکار لیکن ہر دیکھنے والے کو نظر آئے گا کہ ان کا جتنا بھی اہم قدم بڑھا ہے وہ ترقی کی طرف، مغرب کی طرف، یہ اور بات ہے کہ ان کے ہاتھ میں جو سڑک کا نقشہ تھا اس میں یہ سڑک مشرق کی جانب جاتی تھی۔

اگر دنیا کی مجموعی آبادی حضرت آدم کے وقت سے لیکر آج تک یکساں رہتی تو سوسائٹی میں کچھ زیادہ فرق نہ آتا، غالباً انسان اب تک وہی زندگی بسر کرتا جو آج سے ہزاروں سال قبل کر رہا تھا۔ لیکن آبادی کے بڑھتے ہوئے مسئلہ نے ہماری سوسائٹی میں بڑی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں آج سے صدیوں قبل دنیا میں نفع والی تجارت کا وجود نہ تھا اور کسی چھوٹی سی سوسائٹی میں نہ پریس (مطبع) کا وجود ممکن تھا نہ کاغذ کا، حالانکہ یہی دو سب سے بڑے فتنے ہیں جو ہماری تہذیب کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ پریس نے انسانی افکار کو وہ ربط و تسلسل دیدیا جس کا لازمی نتیجہ ارتقائے فکر ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو ایک نئے اخلاق کی ضرورت ہوگی۔ گنجان آبادی اور وسیع میدانوں میں ایک طرح کے انسان نہیں پیدا ہوتے۔ دیہات کی روٹی اور شہر کی روٹی شکل کے اعتبار سے ایک ہو تو ہو قیمت کے اعتبار سے ایک نہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو نئے طریقہ سے کھانا کھلانا ہوگا، اسکے کپڑے کی فراہمی دوسرے انداز پر ہوگی، اور اخلاق مجلسی کے وہ قوانین جو وسیع صحراؤں، نخلستان یا ریگستان میں وضع ہوئے ہوں شہر میں چل نہیں سکتے۔ سینما، ریل گاڑیاں، ٹیلیفون، ڈاک اور تار کے محکمے، ٹرام، بس، ہوائی جہاز بڑی بڑی کمپنیاں صرف بڑی آبادیوں کے بل بوتے پر قایم ہیں اور چلتی ہیں۔ لیکن بڑی آبادیوں کی زندگی اور صحت کا انحصار بھی ان پر ہے۔ وہ تہذیب کے ان مظاہر کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے۔

موجودہ تہذیب بڑی پیچیدہ ہے اور ہمارا ماضی کی طرف رجعت کرنا ناممکن ہے۔ مجھے بڑی شخصیتوں کی سحر آفرینی سے انکار نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ معجزات کا دور ختم ہو چکا ہے اس لئے کوئی شخص زمانہ کے سیل کو تھامنا چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بالفرض محال عارضی طور پر کامیاب بھی ہو گیا تو اپنے پیچھے ایسی طغیانی چھوڑ جائے گا کہ کوئی انسان سنبھل نہ سکے گا۔ انگلینڈ میں عیسائی "جماعت اسلامی" یا "عیسائی وہابیوں" نے اپنی دس سالہ حکومت قایم کی جس نے زمانہ کی رفتار تھامنا چاہا اور عوام کے اخلاق پر نگراں بٹھا دئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی دس سالہ حکومت کے ختم ہونے کے بعد انگلینڈ دوبارہ پستی اخلاق کی آخری منزل میں جا گرا۔ عوام کے رجحانات کو جب بھی دبانے کی کوشش کی گئی وہ زیادہ شدت سے ابھرے۔ انقلاب فرانس اور انقلاب روس سیاسی میدان میں اسی نوع کی کوشش کی مثالیں ہیں۔ امریکہ شراب بند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، قحبہ خانے دنیا میں بند نہ ہو سکے۔

افسوس یہ ہے کہ ہم یہ نہیں محسوس کر رہے کہ ہمارا زمانہ کس طرف جا رہا ہے، ہم جنسی تشنگی کو کیوں نئی طرح سے محسوس کر رہے ہیں کیوں سینما میں اداکاراؤں کی کھلی ہوئی بانہیں، عریاں سینہ، بوس و کنار، جدید ادب کے فحش اشارے، نمائشوں کی

بے معنی سیر کے باوجود ہماری جنسی خلش بڑھتی جا رہی ہے۔ موجودہ جنسی بے چینی کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم عورتوں کو برقعہ میں اور مردوں کو محبس میں بند کر دیں۔ ہمیں اس کا سبب معاشرہ کی خامیوں میں تلاش کرنا ہے۔ معاشری قوانین غالباً زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ جنسی بے چینی غالباً ایک تحریک ہے، ایک بغاوت ہے جو عہد جدید کے انسان نے لاشعوری طور پر قدیم و فرسودہ قوانین کے خلاف کی ہے۔

یہ وہ شعلہ ہے جو چنگاریوں کی شکل میں صدیوں قبل سے غزلوں، مثنویوں، افسانوں اور داستانوں کی تہ میں سلگ رہا تھا۔ یہ وہ جستجو ہے جس نے فنون لطیفہ کی بنا ڈالی، جس نے عورت کے گرد رسوم کی مشعلیں جلا کر شادیانے بجا کر جنس کی پرستش کی۔ جس نے عورت کو کبھی ساری پہنا کر کبھی گھونگھٹ، نکلوا کر، کبھی پردوں میں چھپا کر اس کی دلکشی میں اضافے کئے۔ عہدِ وسطیٰ میں جنس کا یہی مفہوم انسان کے ذہن نشین ہو سکتا تھا۔ مگر آج کی تہذیب بیباک ہے اور اس میں یہ اخلاقی جرأت ہے کہ وہ اپنی خواہشات ظاہر بھی کر سکے۔ موجودہ انسان کی عریانی فطرت صحیحہ کا تقاضا ہے اور اگر آج کا انسان یہ نہ کرے تو وہ مراق و مالیخولیا کا مریض ہو جائے۔ ہم جسے آج اخلاق کی پستی کہتے ہیں وہ ہماری طبیعتوں کا فطری علاج ہے۔ زمانۂ قدیم سے مصلحین یہ کرتے آئے ہیں کہ جب پرانے قوانین نئے زمانہ کے مطالبات پورا نہیں کر سکتے اور ہر شخص انفرادی طور پر انھیں توڑ ڈالتا ہے تو وہ ان قوانین کو بدل ڈالتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوانین کی وقعت جاتی رہتی ہے اور آئین پسندی ختم ہو جاتی ہے آج مذہب کی جانب سے عام بدظنی کا سبب بھی یہی ہے کہ زعمائے مذہب نے وقت کے مطالبات پر نظر نہیں رکھی اور زمانہ کی نبضوں پر انگلیاں نہیں رکھیں۔

آج بھی یہ بزرگان دین عصمت و عفت کے لمبے چوڑے درس تو دے سکتے ہیں لیکن سماج کے دُکھ کو نہیں دیکھتے۔ یہ مرض نہیں سمجھتے لیکن علاج تجویز کرتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام زندگی جب دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہ دے سکا تو ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سرمایہ داری کا دور آیا اور یہ دور بھی زیادہ دنوں تک زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ آج کے نوجوانوں کو بھی معاش کی فکر اتنی ہی ہو جتنی آج سے ۵ سو سال قبل کے نوجوانوں کو بھی اور معاش کی فکر غیر سرمایہ دارانہ نظام زندگی میں بھی باقی رہے گی مگر اس وقت وسائل معاش آسانی سے مہیا ہوں گے۔ پھر زمانہ ہم سے تعلیم و اعزاز کے مطالبے کرتا ہے اور عام طور پر ایک نوجوان پچیس سال سے قبل برسر روزگار ہونے سے قبل شادی سے گریز کرتا ہے۔ لیکن وہ نوجوان جو ۲۵ سال کی عمر میں شادی کرتا ہے عموماً پندرہ سال کی عمر میں بالغ ہوتا ہے۔ اور جنس کی کرید وہ ۱۲ سال کی عمر ہی سے کرنا شروع کر دیتا ہے البتہ چونکہ ہماری سوسائٹی میں جنس ایک ممنوعہ موضوع ہے اس لئے وہ ہم سے آپ سے اس کے متعلق کوئی سوال نہیں کر سکتا۔ ۱۵ سال کے بعد سے وہ جنسی مطالبے محسوس کرتا ہے لیکن وہ مجبور ہے کہ دس سال تجرد کی زندگی گزارے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دس سال تک کسی نوجوان کا مجرد رہنا ممکن ہے اور اگر ایسا ہے تو کس حد تک اور کن نتائج کے ساتھ۔ نفسیات ابھی اپنے عہدِ طفلی میں ہے لیکن وہ ان سوالات کا جواب دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا مشاہدہ بھی ہمیں

مدد دے سکتا ہے - میں عرض کر چکا ہوں کہ ضبط نفس ایک ناقابل عمل اصول ہے اور اگر قابل عمل بھی ہے تو محض مستثنیٰ لوگوں کے لئے - اسکے علاوہ دوسری کھلی ہوئی صورتیں - استمنا بالید، استلذاذ بالمثل اور استلذاذ بالضد ہیں -

مذہب استلذاذ بالضد کو گناہ سمجھتا ہے اور چونکہ سماج اس قانون کو شدت سے منواتی ہے - اس لئے ایک نوجوان مجبور ہو کر دوسرے غیر فطری ذرائع کی طرف مایل ہوتا ہے، حالانکہ گناہ کی حیثیت سے یہ صورتیں استلذاذ بالضد سے بری ہیں لیکن چونکہ یہاں سوسائٹی مداخلت نہیں کرتی یا نہیں کر سکتی ہے اس لئے عام طور پر نوجوان اس کی طرف رجوع کرتے ہیں - اس کا اثر نوجوانوں کی صحت پر کیا پڑتا ہے - آجکل اس کا حال محکمۂ دفاع سے پوچھئے جس کو نوجوان فوجی افسر نہیں ملتے - یا پھر ان رسالوں اور ان دواخانوں سے پوچھئے جن کی روزی کا سارا دارومدار محض ان دواؤں کے اشتہارات پر ہے جو کھوئی ہوئی جوانی دوبارہ لا سکتے ہیں ——— یہ مذہب اور سماج کی قربانگاہ پر اس بھینٹ کی مثال ہے جو ہندوستانی نوجوان پیش کرتا آیا ہے - جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہوگا اس قوم کا مستقبل کیسا ہوگا ؟

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ایک نوجوان ۲۵ برس کی عمر سے قبل شادی کرنا نہیں چاہتا - لیکن اگر ایک نوجوان بالغ ہونے کے بعد ہی شادی کا خواہشمند ہو تو بھی اخلاقاً اس کی شادی کرنا ایک قومی گناہ ہے - کیونکہ شادی اور جنسی خواہشات کی تکمیل دو علٰحدہ چیزیں ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے آم کھانا اور آم کا باغ لگانا کہ آم کھانے کے لئے آم کا باغ لگانے کی ضرورت نہیں -

سوال یہ ہے کہ ۲۵ سال کے بعد بھی سوسائٹی کیوں اس پر مصر ہوتی ہے کہ ہر انسان شادی کئے بغیر جنسی تسکین حاصل نہ کرے - وہ کیوں ایک انسان کی اضطراری مجبوریوں سے فایدہ اُٹھا کر اسے ایک مستقل عذاب میں مبتلا کرنا چاہتی ہے - میں اسے عذاب صرف اس لئے کہتا ہوں کہ یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا اگر سائنسدان ہم سے روٹی طلب کرے اور ہم اسے ہوٹل کھولنے کا مشورہ دیں -

یہی نہیں بلکہ قانون ازدواج کی بنیاد دو غلط مفروضات پر قایم ہے ایک یہ کہ مرد اور عورت ایک طویل مدت تک یکساں جسمانی اور جنسی مطالبات کی شدت قایم رکھ سکتے ہیں، حالانکہ یہ فرض کر لینا کس قدر غلط ہے - دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ ہر عورت بیوی بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور ہر مرد شوہر بننے کے لئے - حالانکہ بعض عورتیں صرف اس لئے پیدا ہوئی ہیں کہ ان سے افلاطونی محبت کی جائے، بعض ایسی ہیں جو صرف چند لمحوں کے لئے رفیق بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں، بعض صرف بیوی بننے کے لئے - یہی حال مردوں کا ہے - انسانی طبایع کا اختلاف ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہیگا اور کوئی معاشری قانون جو اس حقیقت کو نظر انداز کرتا ہے بہت دنوں چل نہیں سکتا -

اگر یہ مشورہ دیا جائے کہ شادی کی رسم مہمل ہے اور جنسی آزادی کو عام ہونا چاہئے تو بہت سے اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں - مثلاً ایک اعتراض یہ ہوگا کہ انسان اور حیوان کا فرق جاتا رہے گا گویا اس وقت انسان اور حیوان میں فرق

صرف شادی کی رسم ہی پر ہے - اس اعتراض کا دوسرا رنگ یہ ہوگا کہ انسانوں میں بہیمیت آجائے گی، حالانکہ بہیمیت سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے جو آپ کو پسند نہ ہو مثلاً انگریز تعدد ازدواج کو بہیمیت جانتے ہیں، مسلمان انگریزوں کی کورٹ شپ کو بہیمیت کہتے ہیں - پہاڑی علاقوں کی عورتوں میں تعدد ازدواج، سویڈن کی ہلکی پھلکی شادیاں اور طلاقیں بھی بہیمیت ہی سمجھی جاتی ہیں لیکن اس اعتراض کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر مرد اور عورت آزاد چھوڑ دئے گئے تو دنیا ایک سماجی نزاع میں مبتلا ہو جائے گی اور آفس والے اپنی آفس بند کرکے، کسان ہل بیل چھوڑ کر، طالب علم کتاب پٹک کر، لڑکیاں اسکول سے بھاگ کر عورتیں آئینہ توڑ کر ایک جنون میں مبتلا ہو جائیں گی - لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ جب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کھانا ہر جگہ ملتا ہے تو آپ ہرگز اتنا نہیں کھائیں گے کہ بدہضمی کے مریض ہو جائیں - البتہ یہ ضرور ہوگا کہ آپ پہلے کی طرح فاقے نہ کریں گے بہت زیادہ امکان ہے کہ اس آزادی کے بعد بھی بعض مرد و عورت باہم ملکر میاں بیوی کی سی زندگی بسر کریں لیکن یہ زندگی توانا ہوگی، خود دار ہوگی اس میں جبر، احساس کمتری اور وہ کشمکش نہ ہوگی جس نے آج ہزاروں گھر کو جہنم بنا دیا ہے - یہ جنسی مساوات کا دور ہوگا - غیر مستقل مزاج طبیعتیں جیسی آج کل ہیں اس وقت بھی ہوں گی لیکن ان میں جو اضطرار جو لپک جو بھبک آج پائی جاتی ہے نہ ہوگی - اور اسکول میں لڑکے زیادہ تندہی اور یکسوئی سے پڑھ سکیں گے کیونکہ انکا ذہن خیالی معشوقوں کی تصویریں نہیں بنایا کرے گا، ان کی رات کی نیند منصوبے بنانے میں ضایع نہ ہوگی ان کی سائیکل کے ٹائر اور پیر کے جوتے تفریح گاہوں کی گشت اور لڑکیوں کے تعاقب میں نہیں گھسیں گے - عورتوں کو بھی بننے سنورنے، حسن کی نمایش اور عشق کے داؤ پیچ سے زیادہ کار آمد چیزیں اپنی طرف متوجہ کر سکیں گی - جنس کے متعلق اتنی استغنائی کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ چند سالوں میں اس کی وہ اہمیت ختم ہو جائے گی جو خواہ مخواہ اس کو انسانوں کی زندگی میں حاصل ہے - جنس کا وہ بت جس کو ہم نہ معلوم کن کن شکلوں میں پوجتے ہیں ٹوٹ جائے گا - ادب میں فحاشی ایک فضول و بے معنی چیز ہو کر رہ جائے گی، اور بہت سی فضول صنعتیں جو عورتوں کے حسن اور عیاشی کو زیادہ دلکش بنانے کے لئے قایم ہوئی ہیں کار آمد صنعتوں سے بدل جائیں گی - قوم کی دولت جو محض نفس کی تسکین میں ضایع ہوتی ہے قوم کی فلاح و بہبود کے لئے صرف ہوگی -

ایک اور اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ رشتہ کی تمیز اُٹھ جائے گی - لیکن سوال یہ ہے کہ اس تمیز کے اُٹھ جانے سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے - آجکل دو آدمیوں کے درمیان بھائی چارہ قدیم اصولوں پر قایم نہیں ہوتا - آج ایک لکھ پتی دوسرے لکھ پتی کا جیسا بھائی ہو سکتا ہے ویسا وہ اپنے حقیقی بھائی کا نہیں - آج رشتہ کا معیار دولت قایم کرتی ہے - اور ایک خاندان کے پچیسوں افراد میں آپس میں کوئی ہمدردی نہیں ہوتی اگر سب ایک طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے - یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میں اس کی زیادہ وضاحت ضروری نہیں سمجھتا - رشتہ کی تمیز اُٹھ جانے سے قانون وراثت پر اثر پڑ سکتا ہے، لیکن اس سے انسانیت کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا - بلکہ متعدد فایدے حاصل ہو سکتے ہیں -

مثلاً یہ فایدہ کیا کم ہے کہ نسلی، قومی، مذہبی، خاندانی امتیازات جس نے ہر قوم اور ہر ملک کو الگ الگ کر رکھا ہے ختم

ہوجائیں گے اور وہ تنگ نظری اور تعصب جس نے ہزاروں کروڑوں انسانوں کی جانیں لی ہیں ختم ہوجائیں گی اور قومیت کا وہ تصور ہی ختم ہوجائے گا جو ہمارے موجودہ امراض کی جڑ ہے۔ اور سوسائٹی اور افراد کا نزاع یا خود ایک انسان کی داخلی نزاعیں جو جنسی اسباب سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کی شخصیت کو منتشر کرتی ہیں ختم ہوجائیں گی۔

ایک اعتراض یہ ہے کہ اس سے دنیا کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھنے لگے گی۔ میرا خیال ہے کہ آبادی کو روکنے کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی نہیں۔ جب جنسی آزادی عام ہوگی تو جنسی تعلیم بھی عام ہوگی۔ اسکول میں لڑکے لڑکیوں کو جنس کی تعلیم دینے میں نہ کوئی دشواری ہوگی نہ عار۔ اور جنسی تعلیم اور یہ امر کہ بچہ پیدا کرنا ایک سخت تکلیف دہ امر ہے اس بات کی ضمانت ہوگی کہ بچے زیادہ پیدا نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی صحت اور توانائی کا خیال بھی عورتوں کو بچہ پیدا کرنے سے گریز کرنا سکھا دیگا اور جب Family System ہی نہیں رہیگا تو بچہ پیدا کرنے سے رہی سہی دلچسپی ختم ہوجائے گی۔

اس کے علاوہ حکومت اگر ولادت پر ٹیکس لگادے تو از خود پیدائش کی رفتار کم ہوجائے گی اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جنسی آزادی دیکر حکومت کو پیدائش کی زیادتی اور کمی پر پورا اختیار ہوجاتا ہے۔ اگر کبھی آبادی زیادہ کرنے کی ضرورت ہوئی تو حکومت ولادت پر انعام اور اعزاز مقرر کرسکتی ہے۔

اس اعتراض کا جواب کہ اگر کمسن بچوں کو جنسی آزادی دیدی گئی تو وہ اپنی صحت برباد کرڈالیں گے ضمناً اس سے قبل دیا جاچکا ہے۔ لیکن جن بچوں کو جنسی آزادی نصیب نہیں ہوتی وہ جنس کی تسکین کے بہت خطرناک اور مہلک ذرائع اختیار کرتے ہیں اس لئے ایسے لڑکے جن کے جنسی رجحانات بہت اشتعال پذیر ہیں انھیں بھی نسبتاً کم نقصان ہوگا کیونکہ فطری ذرائع بہرحال قابل ترجیح ہیں۔

اب ذرا ان فواید کی طرف نگاہ کیجئے جو جنسی آزادی کے بعد حاصل ہوسکتے ہیں۔ جنسی آزادی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عورتیں مردوں کی اقتصادی غلامی سے نکل جائیں گی۔ انھیں کام کرنا ہوگا، حکومت کو ان کے لئے روزگار تلاش کرنا ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو ہندوستان کی کام کرنے والی آبادی میں کتنا اضافہ ہوجائے گا اور اس کا اثر یہاں کی صنعتی اور زراعتی پیداوار، معیار زندگی پر کیسا پڑے گا یہ آپ خود سوچ سکتے ہیں۔

سائنسداں زندگی بھر اپنے دار العمل میں، فنکار اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف رہ سکیں گے اور یکسوئی اور استقلال کے ساتھ۔ ایسا نہ ہوگا کہ ملک و ملت کی بھلائی کی ہزاروں تجویزیں، انسانی زندگی کو خوشگوار بنانے کی بے نظیر صلاحیتیں، اعلیٰ کام کرنے کی استعداد لڑکیوں کے تعاقب میں ضایع ہوجائیں، یہ نہ ہوگا کہ ہم مینا، خورشید اور نسیم کو سینما میں دیکھکر خود کو ملامت کریں، مقبول بیگم اگر بابلی والا سے شادی کرلیں تو اسلام کی ناک کٹے۔ الغرض زندگی کی ہزاروں پیچیدگیاں دور ہوجائیں گی۔ اور یہ ہزاروں لاکھوں پناہ گزیں عورتیں سماج میں اسی وقعت و عزت کی نظر سے دیکھی جائیں گی جس سے ہماری آپ کی بہنیں، بیٹیاں دیکھی جاتی ہیں۔

علاوہ اس کے زندگی کے معیار کا یہ فرق جو آج ملکوں کے درمیان نمایاں ہے، باقی نہیں رہیگا - دولت کی تقسیم مساوی ہو جائے گی کیونکہ لوگ دولتمند ملکوں کو دوڑ پڑیں گے اور وہاں کی دولت آپس میں بانٹ لیں گے اور صنعتیں مقامی ہو کر نہ رہ جائیں گی -

اگر دُنیا میں اقتصادی کمیونزم آ بھی جائے تو وراثتی رجحانات قایم رہیں گے اور کمیونزم کو ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہیگا کہ حکومت سازشوں کی وجہ سے شخصی ہو کر نہ رہ جائے لیکن اگر اخلاقی کمیونزم پیدا ہو گیا تو دولت اور تفوق حاصل کرنے کے وہ بے پناہ محرکات خود بخود ختم ہو جائیں گے -

م - ز

(نگار) مقالہ نگار نے جس جرأت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اگر اسی جرأت سے کام لیکر وہ اپنے نام کے اظہار کی بھی اجازت دیدیتے تو زیادہ مناسب تھا - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے جس قانون کو وہ توڑنا چاہتے ہیں، اس سے وہ خود بھی ڈرتے ہیں اور اصلاح کا یہ طریقہ بہت کم مفید ہوتا ہے -

م - ز صاحب نے جس مسئلہ پر اظہار خیال فرمایا ہے وہ نیا نہیں ہے جنسی آزادی کی خواہش اور ادارۂ ازدواج کی مخالفت یوروپ کے بعض مقامات میں عرصہ سے دیکھی جاتی ہے اور وہاں کی بعض جماعتیں اس پر عمل بھی کر رہی ہیں - لیکن فاضل مقالہ نگار نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ اس کا نتیجہ اس وقت تک کیا رونما ہوا ہے

اس باب میں اصولاً سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہئے کہ فطرت انسانی کا کیا تقاضہ ہے -

اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ملکیت کی خواہش انسان کی بالکل فطری خواہش ہے اور انسان جوں جوں ترقی کرتا گیا اس کی یہ خواہش قوی ہوتی گئی یہاں تک کہ جنسی تعلقات کے سلسلہ میں اس نے ادارۂ ازواج کی بنیاد قایم کی - اس لئے نکاح یا شادی کا رواج کسی جابر بادشاہ کے جابرانہ قانون کا نتیجہ نہیں بلکہ خود ہمارے معاشرہ کی ضرورتوں نے اسے قایم کیا تھا اور جب تک یہ ضرورتیں باقی رہیں گی - یہ ادارہ بھی قایم رہے گا -

فاضل مقالہ نگار کا نظریہ یہ ہے کہ اگر اخلاقی اشتراکیت پیدا ہو جائے تو ازدواج کا جھگڑا ختم ہو سکتا ہے - لیکن شاید انھوں نے غور نہیں کیا کہ اگر اخلاقی اشتراکیت پیدا ہو گئی تو وہ صرف جنسی تعلقات تک محدود نہ رہے گی، بلکہ ہماری زندگی کے ان تمام محرکات کو بھی متاثر کرے گی جن کا تعلق تمدن انسانی سے ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اجتماعی مصالح یکسر نظر انداز ہو جائیں گے اور انسان وحوش و بہایم کی سی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوگا -

---

تذکرہ معرکۂ سخن (اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتا) لیکن اتفاق سے اس کی چند جلدیں اسٹاک میں مل گئی ہیں - اس لئے جن حضرات کو ضرورت ہو فوراً اطلاع دیں - قیمت علاوہ محصول ڈاک چار روپیہ - مینجر نگار لکھنؤ

بوستانِ خیال

کہتے ہیں کہ بوستانِ خیال کی طویل داستان کا مصنف ایک شخص محمد تقی خیال ہے جس نے محمد شاہ کے زمانہ میں اپنے احباب اور اپنی اہلیہ کے اصرار پر ایک مدتِ دراز میں اُس کو لکھا۔

قصہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تقی سبعیہ امامی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا جس کے آخری امام جعفرِ صادق کے فرزندِ اکبر اسمٰعیل تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس فرقے کا عقیدہ ہے کہ فرزندِ موصوف نے اپنے والد کی حیات ہی میں پردہ کرلیا تھا اور یہ کہ وہ مناسب وقت پر پھر نمودار ہوں گے۔ یہ فرقہ اسمٰعیلیہ کہلاتا ہے جس کی ایک مشہور و معروف شاخ کے روحانی پیشوا یا امامِ ظاہر اس زمانہ میں ہزہائنس آغاخاں ہیں۔

اس قصہ کی نو ضخیم جلدیں ہیں۔ یوں تو یہ افسانہ جہاں تک خیالی مناظر سے تعلق رکھتا ہے، حاتم طائی، فسانۂ عجائب اور طلسمِ ہوشربا کی طرح ہے لیکن بوستانِ خیال فی الحقیقت ان سب سے جداگانہ ہے۔ اس افسانہ کا بہت کچھ حصہ تمثیلی انداز کا ہے جس میں مصنف نے اپنے زمانہ کے علمی، حکمی اور مذہبی مسایل و عقاید کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس ذیل میں مصنف نے جا بجا یہ ظاہر کیا ہے کہ طلسمات کیا چیز ہیں اور کیسے ترتیب دئے جاتے ہیں۔ جن و شیاطین دیو اور پری کس قسم کی مخلوقات ہیں۔ باخدا لوگوں کے عملیات، اوراد و وظایف اور ساحروں کے افسوں و جادو میں کیا فرق ہے عامل و حکیم اور ولی کے درجات و مراتب کیا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قصہ کا اصل ہیرو معزالدین ہے جس نے خلفائے بغداد سے مصر چھین کر وہاں نئی خلافت بنو فاطمہ کے نام سے قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ معزالدین ہی وہ خلیفہ تھا جس نے جامعۂ ازہر کی بنیاد ڈالی اور یہ قصہ اس سے متعلق ہے جو فتح مصر پر ختم ہوتا ہے۔

پہلی جلد میں معزالدین کی حرموں کا ذکر ہے۔ اِس جلد کے چند ابتدائی صفحات تاریخ کے انداز پر لکھے گئے ہیں، جن میں حضرتِ جعفر صادق کے فرزند اسمٰعیل کی (بہ وجہ مولودِ اکبر ہونے کے) امامت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اسمٰعیل موصوف کی اولاد سے ایک سید زادہ ملکِ شام سے شمالی افریقہ کے اُس علاقہ میں لایا گیا جس کو مراقش کہتے ہیں۔ سید زادہ کے ایک لڑکا ہوا جس کا نام محمد ابن قاسم رکھا گیا۔ جوان ہو کر اُس نے زور پکڑا اور مہدی موعود کا دعوے کر کے خلفائے عباسیہ کے نائبوں کو زیر و زبر کرنے کے بعد وہاں اُس نے اپنی حکومت قایم کرلی۔ باقی اجزاء اِس جلد کے خیالی

افسانوں پر مشتمل ہیں۔

مصنف نے اپنی خاص صنعت دوسری جلد کے لئے محفوظ رکھی ہے۔ یہاں سے شہزادہ معز الدین کا قصہ شروع ہوتا ہے جو محمد ابن قاسم کا پرپوتا تھا شاہزادۂ مذکور ایک سیاح کے بیان پر اعتماد کر کے شہر فردوسیہ کی عیسائی شہزادی شمسہ تاجدار پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ شہزادی کے نکاح کی شرط یہ ہے کہ اُس کے مورثِ اعلیٰ کی ایک طلسمی کتاب کو کوئی پڑھ دے۔ فردوسیہ کوئی فرضی نام نہیں ہے بلکہ جو علاقہ اب افریقہ کا ساحلی حصہ سائرینِکا کہلاتا ہے اُس کے قدیم لاطینی نام کی معرب شکل ہے۔

شاہزادہ تلاشِ معشوق میں گھر سے نکلتا ہے اور راہ میں با خدا مردِ بزرگ کی خدمت میں باریاب ہوتا ہے جس کا نام حکیم قسطاس الحکمت ہے۔ حکیم صاحب شاہزادے کی یاوری فرماتے ہیں اور تعلیم و تربیت کی غرض سے اُس کو ایک طلسم میں بھیجتے ہیں۔ یہ طلسم ارسطاطالیس کا ترتیب دیا ہوا ہے اور نظام کائنات کا نمونہ ہے۔ یہ بیان کہ طلسم کا بانی ارسطو ہے ظاہر کرتا ہے کہ کارخانۂ عالم کی توضیح حکیم موصوف کے بیان کے مطابق کی گئی ہے۔

شہزادہ طلسم میں داخل ہوتے ہی اپنے آپ کو بھول جاتا ہے کہ وہ کون ہے یا کیا ہے۔ شمسہ کا خیال بھی اُسکے دل سے محو ہو جاتا ہے۔ نہ حکیم صاحب اُس کو یاد رہتے ہیں اور نہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں طلسم میں آیا ہوں۔ تاثیرِ طلسمی سے وہ ایک پریزاد ملکۂ نوبہار پر عاشق ہو جاتا ہے اور اُس کی تلاش و جستجو میں طلسم کے مراحل طے کرتا ہے۔ مصنف کی مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان عالمِ بالا سے دنیائے آب و گِل میں منتقل ہوتے ہی اپنے معشوقِ حقیقی کو بھول جاتا ہے اور معشوقانِ مجازی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عشقِ حقیقی کی تکمیل کے لئے عشقِ مجازی ضروری ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اس قسم کے نکتوں کو مصنف علمی بحث کی طرح پر صراحتاً ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان پر قصہ کے پیرایہ میں کنایتہً روشنی ڈالتا ہے۔

تلاشِ یار میں آوارہ ہو کر شاہزادہ ایک ایسی نہر کے کنارے پہونچتا ہے جس کے اور چھور کا پتہ نہیں۔ لبِ نہر مسلسل چودہ مکانات اُس کو نظر آتے ہیں۔ وہ پہلے مکان پر مقیم ہوتا ہے جو بمنزلۂ کرۂ خاک ہے۔ یہاں اُس کو اپنے معشوق کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اہالی مکان ملکۂ نوبہار سے قطعی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ اُس کو فقط اس قدر معلوم ہو جاتا ہے کہ تاوقتیکہ وہ ہر مکان میں مدت معینہ تک نہ ٹھیریگا منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتا۔ مکانِ اول کی سیر کے بعد وہ مکانِ دوم میں پہونچتا ہے جو کرۂ باد سے متعلق ہے۔ اور اسی طرح پہلے بعد دیگرے آب و نار کے کروں سے متعلقہ مکانات کی سیر کرتا ہے۔ ان چاروں مقامات پر اُس کو کوئی واقفیت حاصل نہیں ہوتی کہ اُس کی معشوقۂ طلسمی کون اور کیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مصنف کو یہ نظریہ پیش کرنا تھا کہ زمین کے گرد چار کرے خاک و باد و آب و آتش کے ہیں اور انھیں کروں کی خصوصیات کو قصہ کے پیرایہ میں رنگ آمیزیوں کے ساتھ اس نے ظاہر کیا ہے۔

اس کے بعد شہزادہ کو آگے کی سات منزلوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ ساتوں منزلیں قمر سے زحل تک سات سیاروں سے

متعلق ہیں۔ ہر منزل کی سیر کا افسانہ انھیں خصوصیات سے متعلق ہے۔ جو ان سیاروں کے لئے تسلیم کی جاتی ہیں۔ مثلاً منزلِ قمر میں پیشہ وروں اور قاصدانِ سریع الرفتار وغیرہ کے مناظر پیش کئے گئے ہیں جو قمر کے متعلقات سے ہیں۔ عطارد میں دبیرِ فلک کی شکل وصورت دکھائی گئی ہے۔ مشتری سے متعلق سنجیدگی وحلم۔ علم وپاک نفسی کے اذکار ہیں۔ منزلِ آفتاب میں شہزادے کو ملکۂ صبح دلکشا کے دربار میں بہ سواریِ شیر پہونچایا جاتا ہے جس کے پایۂ تخت کا شہر بیدار دلاں نام ہے۔ یہاں نیند گناہ عظیم ہے۔ ملکہ کے دربار میں بادشاہوں کے معاملات پیش ہوتے ہیں۔ ملکۂ مذکور آفاق شاہ کی لڑکی ہے لیکن وہ آفاق شاہ کے سامنے اُس کے سطوت وجلال کی وجہ سے کبھی سامنے نہیں آئی اور نہ اُس کے دیکھنے کی طاقت رکھتی ہے۔ منزلِ زہرہ میں رقص وسرود کی تعلیم کی کیفیت ظاہر کی گئی ہے۔ مریخ کے مقام پر خونی منظر پیش کیا گیا ہے جس میں چار بادشاہ ایک منارہ نشین عورت کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور باہمی بغض وحسد سے جنگِ عظیم برپا کر کے قتلِ عام کا باعث ہوتے ہیں۔ زحل کے دائرہ کی سیر میں شہزادہ کی عقل وفراست پر نحوست چھا جاتی ہے۔ وہ حبشیوں کے ملک میں پہونچتا ہے۔ زراعت پیشہ لوگوں سے ملتا ہے۔ فسق وفجور اور فتنہ وفساد کے مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ سب باتیں دلچسپ قصوں کے رنگ میں بیان کی گئی ہیں اور اس طرح لکھی گئی ہیں کہ آسانی کے ساتھ ذہن اُن کے معنوی مفہوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ سیاروں کی دیگر خصوصیات مثلاً اُن کے دورہ کی مدت وغیرہ بھی دلچسپ پیرایہ میں کہانیوں کی ذیل میں آجاتی ہے۔ دو مثالیں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) منزلِ عطارد میں شہزادے کی ملاقات ایک پیر مرد سے ہوتی ہے جو دوات وقلم لئے بیٹھا ہے اور لکھنے پڑھنے میں مشغول ہے۔ اُس کی ایک طرف ایک پیکر استادہ ہے جس کا جسم نصف نسوانی اور نصف مردانہ ہے۔ دوسری جانب ایک آدمی اپنے سر پر گیہوں کے خوشے لئے کھڑا ہے۔ پیر مرد خود کو مالکِ مکان ظاہر کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ اُس کے دائیں بائیں جو پیکر ہیں وہ اُس کے گھوڑے ہیں۔ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ہم سات بھائی ہیں جن میں پانچ بھائیوں کے دو دو گھوڑے اور دو کی سواری کے لئے ایک ایک گھوڑا ہے۔ لیکن ہر گھوڑے پر سوار ہونے کی نوبت ہر بھائی کو آجاتی ہے۔ سب سے بڑا بھائی تیس برس میں اپنا دورہ ختم کرتا ہے۔ اُس سے چھوٹا بارہ برس میں وغیرہ وغیرہ۔

(۲) مشتری کے مقام پر ایک معشوقہ ایک معمۂ منظوم کا حل اپنے نکاح کی شرط قرار دیتی ہے۔ معمہ یہ ہے:۔

چہ گوہریست کہ اورا بزیر ہفتم بام — زلطف روزِ ازل بادشاہ داد مکاں
جمالِ روشنِ او ہست بسکہ گندم رنگ — بخلق حسن وملاحت ازو شدست عیاں
ہمیشہ در سفرست وبس از دوازدہ سال — بمنزلے کہ رود میکند گذار دراں
ازاں بعلم نمایند نسبتِ نامش — کہ عالمانِ برادیند طفلِ ابجد خواں
گہش خطاب نمایند نیک ونیک بزرگ — بلند پایۂ دوئم گہش دہند نشاں

ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ مصنف نے اپنے افسانوں کی بنیاد علمی اور ادبی نکتوں پر رکھی ہے۔

یہ بات کہنے سے رہ گئی کہ ہر قصر میں صاحبِ مکان ایک نازنین ہے جو اُنھیں خصوصیات سے متصف ہے جو سیاروں سے متعلق ہیں۔ مثلاً نازنین قصرِ زہرہ رقص و سرود میں ماہر ہے۔ قصرِ مریخ میں رقصِ ترکانہ خونخواری کا پہلو لئے ہوئے ہے اور وہاں کی نازنین اسلحۂ جنگ سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ غرضکہ مصنف کو سیاروں کی روش، شکل، منسوبات اور خواص کا بیان مقصود تھا جو اُس نے قصہ کے لباس میں پیش کیا ہے۔ اِن مقامات پر بھی شاہزادہ کو اپنے معشوقۂ طلسمی کا کوئی نشان اور سراغ نہیں ملتا۔ البتہ اس قدر معلوم ہو جاتا ہے کہ نوبہار ایک بادشاہِ عظیم کی لڑکی ہے۔

سیاروں کے بعد بارھویں منزل منطقۃ البروج کی ہے۔ یہاں پہونچکر شاہزادہ ہر برج کے ثوابت اور اُنکے ناموں سے فرداً فرداً واقفیت حاصل کرتا ہے اور قصرِ ثمن کے آخری ایوان میں معشوقۂ دلفریب ملکہ نوبہار کی ایک جھلک دیکھ پاتا ہے۔ پھر کرسی و عرشیہ و اعلےٰ علیئین کے شہروں کی سیر کرتا ہے جو بادشاہ طلسم کی سیر کے مقامات ہیں۔ مقامات مذکورہ میں بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہونے کا سال بھر میں ایک ایک دن مقرر ہے۔ مگر باریابی کا طریقہ جدا جدا ہے۔ ایک مقام پر ایک ایوانِ تاریک میں درباری صف بہ صف استادہ ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ کے برآمد ہوتے ہی اُس کے تاج کی ضیا سے ایوان روشن ہو جاتا ہے لیکن حاضرین کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور گوش و زبان بے حس ہو جاتے ہیں۔ شاہزادہ دربار کے موقعہ پر پہونچتا ہے۔ مہمان ہونے کی وجہ سے وہ بادشاہ کو دیکھتا ہے اور پہچان لیتا ہے کہ اُس کی معشوقہ وہی ہے۔ وہ اُس سے باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن نوبہار چند لمحہ کچھ گفتگو بیرخی سے کرکے رخصت ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ کا دستور یہ ہے کہ خواصِ شہر ایک ایوان میں جاتے ہیں، جہاں حجرے بنے ہوئے ہیں۔ ہر شخص اپنے نام کے حجرے میں داخل ہوتا ہے اور ایک نصب شدہ آئینہ میں بادشاہ کی زیارت کرتا ہے۔ بادشاہ کی شکل ہر آئینہ میں مختلف ہوتی ہے اور ہر شخص کو اُس کے مرتبہ اور کیفیت قلب کے مطابق بادشاہ کی صورت نظر آتی ہے۔ شاہزادہ بھی آئینہ میں نوبہار کو دیکھتا ہے۔ اس دفعہ صبح دلکشا بھی نوبہار کے ساتھ ہے۔ ملکہ اُس کو شاہزادے کے سامنے ڈھکیل کر اوجھل ہو جاتی ہے۔ بات یہ تھی کہ منزلِ آفتاب میں شاہزادہ صبح دلکشا کی جانب کچھ مایل ہو گیا تھا اور یہ امر نوبہار کو ناگوار گزرا تھا۔ تیسری جگہ کا طریقہ یہ ہے کہ بارگاہ بادشاہی کے مقبول بندوں کو دربار شاہی سے بادشاہ کی تصویریں عنایت کی جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ بادشاہ کی زیارت ایک عبادت ہے جو مقررہ اوقات پر ادا ہونی چاہئے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مصنف کی یہ خیال آرائی اُس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خواہ عالمِ ملکوت ہو یا عالمِ سفلی ہر طبقہ یا جماعت جدا جدا طریق پر تسبیح و تہلیل و عبادت میں مصروف ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اصل و ماہیت سے کوئی واقف نہیں۔ جیسی جس کی قابلیت ہے اُس کے لحاظ سے ہر شخص کا خدا ایک علٰحدہ نمونہ اور طرز کا ہے اور اس لئے اُس کی عبادت کے طریقے بھی طرح طرح کے ہیں۔

ایک اور بات جس کی طرف اسی ذیل میں ذہن منتقل ہوتا ہے یہ ہے کہ شاہزادہ کی رسائی معشوق تک بتدریج ہوتی ہے۔ ابتدائی مراحل میں اُسے کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔ بعد مدت وہ ایک جھلک دیکھ پاتا ہے۔ اُس کے بعد چند ساعت

ہمکلامی کی نوبت آتی ہے لیکن ایسی حالت میں جبکہ ایک ذراسی لغزش سے اُس نے اپنے معشوق کو ناراض کر دیا ہے۔ راہِ خدا کے سالک کو بھی ایسی ہی منزلیں اسی طرح طے کرنا ہوتی ہیں۔

جب شاہزادہ اُس مقام پر پہونچتا ہے جہاں تصویریں عنایت ہوتی ہیں تو وہ بھی ایک تصویر کی خواہش کرتا ہے اور بعد از ہزار خرابی ایک تصویر اُس کو ملجاتی ہے لیکن جب وہ تصویر دیکھتا ہے تو اُس کو صبحِ دلکشا دکھائی دیتی ہے اور وہ ایک عالمِ وحشت میں صحرانورد ہو جاتا ہے۔ اِس حالت میں وہ ایک مسجد بیت المعمور نامی میں پہونچایا جاتا ہے یہ مسجد عالمِ مثال تک پہونچنے کا زینہ ہے۔ تمثیلاً بیت اقصیٰ اُسی کا عکس ہے۔ یہاں سے وہ ایک ایسے خطّہ میں پہونچتا ہے جو بجائے خود ایک علٰحدہ طلسم اندر طلسم یا عالمِ کبیر کے اندر عالمِ صغیر ہے۔ ملحوظِ خاطر رہے کہ جماعتِ اسمٰعیلیہ کا عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن اور ہر باطن کا ایک ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ طلسم ارسطو کے اندر بھی طلسم ظاہر و باطن بہت سے ہیں۔ شاہزادہ اب جس خطّہ میں داخل ہوتا ہے اُس کا نام چہار حصار ہے۔ اس کے وسط میں ایک بادشاہ عظیم القدر موسوم بہ سلطان روح الملک حکومت کرتا ہے۔ اُس کے چار رئیس چار گوشوں میں نیابتہً حکمرانی کرتے ہیں۔ جب تک سلطان چاروں رئیسوں سے ایک سا برتاؤ رکھتا ہے کاروبارِ سلطنت خوش اسلوبی سے چلتا رہتا ہے لیکن جب وہ اُن میں سے کسی پر زیادہ مہربان ہو جاتا ہے تو بقیہ رؤسا کو ناگوار گزرتا ہے اور آپس میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ سلطان کی حکومت میں فتور واقع ہونے لگتا ہے اور انتظامِ سلطنت میں خلل شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے اوقات میں اُس کا ایک قدیم دشمن سر اُٹھاتا ہے اور اپنے سردارانِ فوج کو یکے بعد دیگرے سلطان کے علاقوں پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دیتا ہے۔ یہ دشمن آدم خوار ہے اور علاقۂ سلطان کے چاروں طرف بیابانِ عدم میں رہتا ہے۔ جس قدر سلطان کے رئیسوں میں نفاق بڑھتا جاتا ہے اُسی قدر دشمن کے سردارانِ فوج شاہی قلعوں کو مسخر کر کے اُن پر قابض ہوتے جاتے ہیں۔ نفاقِ کامل کی صورت میں بالآخر جب سلطان قلبِ سلطنت میں محصور ہو جاتا ہے تو دشمنِ آدم خوار بھی موقعہ پر آ پہونچتا ہے اور سلطان کو عدم کا راستہ دکھاتا ہے۔

شاہزادہ ایسے وقت چہار حصار میں داخل ہوتا ہے جب چاروں رئیس نفاق کی وجہ سے بادشاہ سے منحرف ہیں اور دشمن کی فوجوں نے بہت سے قلعوں کو سر کر لیا ہے۔

حصار میں داخل ہوتے ہی شہزادہ کی ملاقات ایک بادشاہ اقبال شاہ نامی سے ہوتی ہے۔ یہ بادشاہ بقول خود چاروں رئیسوں کی باہمی مفاہمت کے لئے فوج ہمراہ لیکر جا رہا ہے۔ سلطان نے یہ شرط قرار دی ہے کہ جو شخص رئیسوں میں مصالحت کرا دے گا سلطان اپنی لڑکی ناطقہ روشن بیان سے اُس کا عقد کر دے گا اقبال شاہ اُس شہزادی سے اپنے بھائی مقبل کی شادی کرانا چاہتا ہے۔ شاہزادے کو اپنے ساتھ چلنے اور رئیسانِ اربعہ کو راہِ راست پر لانے کے لئے اس بہانہ سے آمادہ کرتا ہے کہ اُس کا مطلب بھی اسی ذیل میں حاصل ہو جائے گا۔ واضح ہو کہ شہزادے کو یہ بات طلسم سے باہر نکلنے پر حکیم صاحب سے معلوم ہو گی کہ اقبال شاہ شہزادے کے طالع کا موکل ہے جس کو حکیم صاحب نے مسخر کر کے بشکلِ انسان

شہزادہ کی مدد کے لئے طلسم میں مقرر کیا ہے۔

الغرض جب شہزادہ مصالحت کے لئے اقدام کرتا ہے تو ہر رئیس کی جانب سے یکے بعد دیگرے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ جب تک اُن کے ربّ النوع کا مہری حکم اُن کو نہ دکھایا جائے گا وہ مصالحت نہیں کر سکتے۔ یہ ربّ النوع انھیں بارہ برجوں اور سات سیاروں کے موکل ہیں جن کے منازل کی بالاجمال سیر شہزادہ کر چکا ہے۔ یہاں رنگ بالکل جداگانہ ہے۔ یعنی خیال آرائی اس طور پر کی گئی ہے کہ ہر برج میں ان سیاروں کے جدا جدا اقتران و افتراق سے کاروبار اور افعالِ انسانی پر جو اثر پڑتا ہے اُن اثرات کے تحت ہزار ہا رنگ کے افسانوں کی طلسم بندی کی گئی ہے۔ برجوں میں ستاروں (ثوابت) کے جو مجموعے ہیں منجمین نے اُن کی شکلیں قائم کر کے انھیں شکلوں کے اعتبار پر اُن کے نام رکھے ہیں۔ صاحبانِ موصوف نے یہ بھی قرار دیا ہے کہ جب کوئی ایک یا دو سیارے کسی ایک برج میں ہوتے ہیں یا بالمقابل ہوتے ہیں تو دنیا کی آب و ہوا اور کاروبار پر ایسے اقتران و تقابل وغیرہ کا کیا اثر ہوتا ہے۔ مصنفِ داستان نے یہ سب باتیں تفصیل کے ساتھ دلچسپ قصوں کے ڈھنگ پر بیان کی ہیں مختصر طور پر یہاں دو قصوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

(۱) مریخ و زحل کا قِران ایک برج میں ہے۔ شہزادہ ایک ایسے شہر میں پہونچتا ہے، جس کے بیچ میں ایک نہر واقع ہے۔ نہر کا پانی نصف سرخ اور نصف سیاہ ہے۔ سرخ پانی کی جانب ترکانِ خونخوار کی آبادی ہے اور آبِ سیاہ کی طرف زنگیانِ تیرہ رو رہتے ہیں۔ شہزادہ کا گزر اولاً سرخ حصّۂ شہر میں ہوتا ہے۔ چوری، قتل اور زنا کی یہاں گرم بازاری ہے۔ اس مقام کی مصیبتوں میں پھنس کر شاہزادہ زیست سے تنگ ہو جاتا ہے اور نہر پر پہونچکر دوسری طرف چھلانگ مارتا ہے۔ نحوست کے اثر سے اُس کی عقل پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جست اُس کو آبِ سیاہ میں گراتی ہے۔ اور حبشی اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ فتنہ و فساد سر اُٹھاتا ہے اور بالآخر قاضیانِ سُرخ و سیاہ یہ قرار دیتے ہیں کہ شہزادہ سے دوبارہ نہر عبور کرائی جائے اور اُس کو وہاں رکھا جائے جہاں کہ پانی میں وہ گرے۔ شہزادہ جست کرتا ہے اور نہر میں اس طرح گرتا ہے کہ اُس کا نصف جسم کالے پانی میں ہوتا ہے اور نصف سرخ میں۔ فریقین کے بادشاہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ شہزادہ دونوں کا مہمان رہے۔ چنانچہ دونوں بادشاہ اپنی اپنی لڑکیوں کا عقد اُس سے کر دیتے ہیں۔ ایک خوئے ترکانہ رکھتی ہے اور دوسری ساحرہ ہے۔ حسد سے دونوں ایک دوسرے کو مار ڈالتی ہیں۔ اس پر قاضیانِ شہر شاہزادے کو مجرم قرار دیکر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ شہزادے کو پہلے افعیٔ سیاہ سے ڈسوایا جائے اور پھر سولی دیدی جائے۔ یہ قران النحسین کے اثرات کا چھوٹا سا قصہ ہے۔

(۲) دوسری مثال قران السعدین (قرانِ زہرہ و مشتری) کی ہے جس میں شہزادہ ایسے مقام پر پہونچتا ہے جہاں موکلانِ برج شہزادے کی ملاقات نوبہار سے کرا دیتے ہیں۔

زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں کہ سلطان روح الملک جسم انسان کی نمایندگی کرتا ہے اور اُس کے چاروں رئیس اخلاط اربعہ ہیں جن کا امتزاج متناسب جسم کو صحیح حالت میں رکھتا ہے اور جن کی زیادتی یا کمی صحت کو برباد کر دیتی ہے۔

بیابانِ عدم میں رہنے والی دشمنِ آدم خوار موت ہے۔ اُس کی فوج وہ بیماریاں ہیں جو انسان کو لاحق ہوتی ہیں اور قلعہ ہائے سلطانی جسمِ انسانی کے اعضائے رئیسہ ہیں۔ مصنف کے بیان کے مطابق اخلاطِ اربعہ اور جسم کی حالت بھی سیاروں کے اثرات کے تحت ہے اُسی طرح جیسے کاروبار اور افعالِ انسانی گردشِ فلکی کے زیر اثر واقع ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نیرنگیوں کے ساتھ اگر یہی باتیں بیان کی جائیں تو کچھ دلچسپ ہو جاتی ہیں۔

فی الجملہ شاہزادہ کو ہر برج کی سیر نئے ڈھنگ پر کرائی جاتی ہے۔ وہ موکلانِ برج و سیارہ سے روشناس ہوتا ہے اور اُن کی امداد سے چاروں رئیسوں کو متفق کر کے سلطان کو دشمن سے نجات دلاتا ہے۔ اقبال شاہ شہزادے کا عقد نامِ نہادُ مقبل؛ ناطقہ سے طے کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ شاہزادے کی ملاقات ناطقہ سے نہیں ہوتی مگر وہ بطور مہمانِ شاہی وہیں قیام کرتا ہے۔ ناطقہ کی دایہ امّارہ محلدار اُس کو سیر گاہِ سلطانی کی سیر کراتی ہے۔ اثنائے سیر میں ایک مقام پر شہزادے کی ملاقات صبحِ دلکشا سے ہوتی ہے۔ امّارہ تخلیہ کرا دیتی ہے اور شہزادے کو آمادہ کر دیتی ہے کہ خلوت میں شہزادہ صبحِ دلکشا سے لطفِ صحبت اُٹھائے جوں ہی شہزادہ محلدار کے ورغلانے سے اختلاط شروع کرتا ہے وہ مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ سیر گاہ سے بیک بینی و دو گوش نکال دیا جاتا ہے۔ یہ مقام وہ تھا جس کی آخری سیر کی جگہ چودھویں منزل یا منزلِ خاص تھی جہاں اُس کی ملاقات ملکۂ نوبہار سے ہونا تھی۔ نوبہار ہمیشہ شہزادے کے احوال کی نگرانی رہتی تھی۔ دو پریزاد (بمنزلہ کراماً کاتبین) شہزادہ کے ساتھ پوشیدہ رہ کر اُس کے نیک و بد کی خبر ملکۂ نوبہار کو دیتے رہتے تھے۔ منزلِ آفتاب میں جب شہزادہ صبحِ دلکشا کی جانب کچھ ملتفت ہوا تھا تو یہ بات نوبہار کو ناگوار گزری تھی اور اس لئے قصرِ مشمن میں وہ کسی قدر بیرخی سے پیش آئی تھی۔ ناطقہ کا عقد بھی ناگوار گزرا۔ اب سیر گاہِ سلطانی میں جب شہزادہ کو دلکشا سے پھر مختلط پایا تو رشک و حسد سے شہزادے کو سیر گاہ سے نکلوا دیا۔ شاید سالکانِ راہِ خدا کو بھی ایسے ہی مرحلے پیش آتے ہیں اور نفسِ امّارہ کی حرکتوں سے مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آخر کار ہزاروں مصیبتیں اُٹھانے اور سبق آموز عبرت مناظر دیکھنے کے بعد شہزادہ چودھویں منزل میں داخل ہوتا ہے جس کو قصرِ نادرہ رازدار بھی کہتے ہیں۔ نادرہ ملکۂ نوبہار کی وزیر اور ندیم خاص ہے اور حکیم صاحب اور ملکہ کے درمیان وکیلِ مطلق اور رازدارِ طلسم ہے۔ نادرہ بہت زور لگاتی ہے کہ نوبہار کی ناراضگی رفع ہو جائے لیکن ملکہ کسی طرح شہزادہ کے حال پر ملتفت نہیں ہوتی۔ انجام کار شہزادہ کو ایک امتحان گاہِ عشق و ہوس میں بھیجا جاتا ہے اور وہاں سے وہ سُرخ رو برآمد ہوتا ہے۔ نوبہار آمادۂ التفات ہوتی ہے لیکن اِس درمیان میں ناطقہ کی ایک طنزیہ گفتگو اُس کے کانوں تک پہونچتی ہے اور وہ پھر برہم ہو جاتی ہے اور اسی عالمِ غیظ و غضب میں یہ عہد کر کے تنہا گھر سے نکل جاتی ہے کہ اگر شہزادہ بلا شرکتِ غیرے اُس سے نہیں مل سکتا تو وہ ہرگز عقد نہیں کرے گی۔ یہ حال سنکر شہزادہ پر بھی وحشت سوار ہو جاتی ہے۔ حکیم طلسم کی حکمت سے دونوں جدا جدا ایک آراستہ و پیراستہ لشکر میں پہونچتے ہیں اور ایک دوسرے کی لاعلمی میں الگ الگ ٹھیرائے جاتے ہیں۔

لشکر میں داخل ہونے کے دوسرے ہی دن اُن کا عقد ٹھہر جاتا ہے۔ دونوں مجوزہ عقد سے برہم ہوتے ہیں اور نوبہار وقت عقد خودکشی کا قصد رکھتی ہے۔ اُن کو سمجھایا جاتا ہے کہ اُس کیمپ کا دستور ہے کہ کوئی شخص بغیر عقد کے وہاں نہیں رہ سکتا اور یہ کہ مرد و زن جو کوئی بھی لشکر میں داخل ہوتا ہے اُس کا مقدرہ زوج بھی اُنھیں اوقات میں وہاں پہونچتا ہے اور عقد کے بعد دونوں ایسے راضی اور خوش ہوتے ہیں کہ بجز سالارِ لشکر کو دعا دینے کے اور کوئی حرف اُنکے لب پر نہیں آتا۔ غرضکہ زبردستی عقد ہو جاتا ہے اور مدت کے بچھڑے ایک دوسرے کو پہچان کر ملتے ہیں۔ یہ طلسمی عقد صحبتِ پاکبازانہ کے لئے تھا۔ چنانچہ نوبہار شاہزادے کو اپنے مقام پر لاکر لطف صحبت اُٹھاتی ہے۔ بعد چندے شاہزادے کی طبیعت عیشِ عارضی سے اُکتانے لگتی ہے اور وہ تازہ سیر کا طالب ہوتا ہے۔ ملکہ ٹالتی ہے مگر شہزادہ کا اصرار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ حالاتِ موجودہ سے بیزار ہوتا جاتا ہے۔ اب صبح و شام اُس کو یہ خیال بھی ہونے لگا ہے کہ وہ کون ہے اور اُس کو کچھ کام بھی کرنا ہے یا یونہی دن گنواتا ہے۔ نوبہار کو اس بیزاری اور اصرار سے رنج و ملال ہوتا ہے اور وہ شاہزادہ کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتی۔ اس لئے وہ ایک ایسے مقام کو جس کی سیر کرنا باقی رہ گئی ہے شاہزادہ سے چھپاتی ہے۔

اس مقام کا نام گنبدِ گیتی نما ہے۔ یعنی اُس میں دنیا کے ساتوں اقلیموں کی سیر ہوتی ہے۔ مشہور و معروف شہر۔ کوہ۔ دشت و دریا اور وہاں کے نوادر اس گنبد میں نظر سے گزرتے ہیں۔ اسی مقام کی سیر کے دوران میں شہزادہ طلسم سے باہر نکل جاتا ہے۔ اہالیان طلسم کے لئے شاہزادہ کا طلسم سے باہر جانا موت کی برابر ہے۔ اس لئے ملکہ ہر امکانی کوشش کرتی ہے کہ اُس گنبد کا حال شاہزادہ کو نہ معلوم ہو لیکن ناطقہ کی کارسازی شہزادے کو اس مقام کا پتہ دیتی ہے اور یوں شہزادہ بیرونِ طلسم حکیم صاحب کے پاس پہونچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گنبدِ گیتی نما جغرافیہ کی کتاب ہے جس میں ملکوں کی تقسیم۔ آب و ہوا۔ شہروں کے احوال۔ پہاڑ اور دریاؤں کی کیفیت اور جس جس جگہ کوئی چیز قابلِ دید ہے اُس کا حال بیان کیا گیا ہے۔ سیرِ طلسم اور معشوقۂ طلسمی سے شہزادے کی بیزاری اس بات کی خبر دیتی ہے کہ عشقِ مجازی گو عشقِ حقیقی کی سمت ایک منزل ہو لیکن وہ ایک عارضی شے ہے اور انسان کی طبیعت اُس سے جلد بھر جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہر انسان کے دل میں اخیر عمر میں دنیا کے حالات سے بیزاری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ بیزاری نہ سہی تو بھی ایسے خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں کہ وہ دُنیا میں کس لئے آیا ہے۔ خود کیا شے ہے۔ کارخانۂ دنیا کیا ہے اور خدا تک کس طرح پہونچنا چاہئے وغیرہ۔ کم از کم صبح کی خاموش فضا میں اس قسم کے خیالات ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور یہی کیفیت مصنف کو افسانہ کے طور پر ظاہر کرنی مقصود تھی۔ گنبدِ گیتی نما عالمِ مثال کا بھی نمونہ ہے۔ یعنی شہزادہ جو باتیں وہاں دیکھتا ہے وہی واقعات دنیا میں اُس وقت رونما ہو رہے ہیں۔ مثلاً جب شہزادہ اقلیم افریقہ کی سیر میں اپنے شہر اور محل میں پہونچتا ہے تو جس حالت میں اپنے ماں باپ کو دیکھتا ہے ویسی ہی اُن کی حالت شہزادہ کے فراق میں واقعۃً ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ طلسم سے باہر نکلنے پر حکیم صاحب شہزادے کو مسایل علمیہ و حکمیہ کی تعلیم دیتے ہیں اور غرق شدہ خطۂ یونان میں آب رواں لے جاکر شجرۃ العقل سے ثمرۃ الفہم حاصل کر کے کھلاتے ہیں۔ بعد تعلیم و تربیت شہزادہ دیار شمسہ کو روانہ ہوتا ہے۔ وہاں بہت سے مختلف المذاہب بادشاہوں کا مجمع ہے جن میں کوئی طبیعتِ مجردہ کا قایل ہے۔ کوئی مسیلمہ کذاب یا ابن ملجم کا پیرو ہے۔ مسلمان بھی ہیں۔ عیسائی بھی اور ملحد و ساحر بھی۔ شاہزادہ کو دورانِ کتاب خوانی میں ان سب سے بحث مباحثہ کرنا ہوتا ہے اور بالآخر جنگ کر کے وہ ان سب کو زیر کرتا ہے۔ کتاب پڑھنے کے لئے چراغدانِ سلیمانی اور دیگر اشیاء کی ضرورت ہے جن کی فراہمی کے لئے اُس کو نئے نئے طلسموں میں جانا پڑتا ہے۔ منجملہ اُن کے جس طلسم میں چراغدانِ سلیمانی ہے اُس کا نام طلسم سبعہ سباع ہے۔ اس طلسم میں شاہزادہ سات درندہ جانور ریچھ۔ بھیڑیا۔ سور وغیرہ کو ہلاک کر کے چراغدان حاصل کرتا ہے جس کی روشنی میں کتاب پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کی تعبیر یوں کی جا سکتی ہے کہ اسرار حقیقت کے جاننے کے لئے قوائے حیوانی اور نفسانی خواہشوں کو قابو میں لاکر عقل سلیم کی روشنی حاصل کرنا ضروری ہے۔

کتاب طلسمی میں شمسہ تاجدار کے مورثانِ اعلیٰ کے کارنامے درج ہیں۔ یہ مورثانِ اعلیٰ دو بھائی ہیں۔ ایک خورشید تاج بخش صاحب قرانِ اعظم۔ دوسرا بدرِ منیر صاحب قرانِ اصغر۔ دونوں کی طبیعتیں جدا جدا نوعیت کی ہیں۔ صاحبقرانِ اعظم کی شخصیت روحانیت کا پہلو لئے ہوئے ہے یعنی وہ صرف اپنی روحانی قوت اور حسنِ خلق سے دلوں کو مسخر کرتا ہے اور فتوحات حاصل کرتا ہے۔ صاحبقرانِ اصغر جہاں پہلوان ہے اور قوائے حیوانی کی نمایندگی کرتا ہے۔ یہ نئی دُنیا میں پہونچایا جاتا ہے۔ غالباً مصنف کے زمانہ میں امریکہ نیا نیا دریافت ہوا تھا یا اُس کے متعلق کیفیت مشرق میں تازہ بتازہ پھیلی ہو۔ مصنف کا شاید اشارہ اس طرف بھی ہو کہ پرانی دُنیا کی بنیاد روحانیت پر تھی اور نئی دنیا کا مقصود مادی ہے۔

ناظرینِ داستان سب سے پہلی بات جو محسوس کر سکتے ہیں یہ ہے کہ شاہزادے کے معین اور مددگار حکیم قسطاس ِحکمت شاگرد اور اُن کے تھے۔ جب تک شاہزادہ طلسم ارسطو میں رہا وہ پوشیدہ طریق پر اُن کی مدد کرتے رہے اور بیرون طلسم علانیہ طریق پر یاوری کرتے رہے۔ اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ انسان کو ہمیشہ ایک ہادی یا امام کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ پوشیدہ ہو یا ظاہر۔ پوشیدگی کی صورت میں اُس کے قایم مقام کام کرتے ہیں۔

مضمون طول پکڑتا جاتا ہے ورنہ اس داستان میں جا بجا بہت سے نکات اور مسایل کی توضیح قصہ کے رنگ میں پائی جاتی ہے۔ چند کا تو سطور بالا میں ذکر آچکا ہے۔ باقی کی اس مضمون میں گنجایش نظر نہیں آتی۔ صرف ایک دو مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

شہزادے کے چار عقد تو مقرر ہیں لیکن ایک اور منسوبہ بلند پایہ پیدا ہو جاتی ہے جو کنیز بنکر حرم میں داخل ہونا پسند نہیں کرتی، حکمائے عظیم القدر اور بزرگانِ باخدا مشورہ کرتے ہیں۔ بحث میں متعہ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایک فریق یہ کہتا ہے کہ ممنوع ہے دوسرا فریق اُس کی مخالفت کرتا ہے۔ آخر حضرت علیؑ کی خدمت میں یہ سوال پیش کیا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق حکم یہ صادر ہوتا ہے کہ جو طریقہ پیغمبر صاحب اور آپ کے جانشین اول کے زمانہ میں رائج تھا اُس کے منسوخ کرنے کے اہل خلیفۂ ثانی نہ تھے۔ دوسرے

قول کے مطابق اس معاملۂ خاص میں حضرت علی بعد از استمزاج حضرت عمر متعہ کی منظوری صادر فرماتے ہیں۔

اسی طرح تعدد ازدواج کا مسئلہ بھی معاملہ بندی کی شکل میں پیش نظر آجاتا ہے۔ شمسہ تاجدار کی شخصیت متین، سنجیدہ اور بردبار ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ملکۂ نوبہار تیز طرار اور شوخ طبیعت ہے۔ جب یہ سب لڑکیاں پانچویں منسوبہ کا حال سنتی ہیں تو نوبہار سے نہیں رہا جاتا اور وہ بلا تکلف حکمائے عالیقدر کی نسبت اپنا یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ ان صاحبان نے عجیب پیشہ قرم ساقی اختیار کیا ہے۔ شمسہ یہ جواب دیتی ہے کہ خدائے تعالٰے نے جب چار نکاحوں کی اجازت دیدی ہے تو حکما کا اس میں کیا قصور ہے۔ عورتوں کو چاہئے کہ حکم خدا سے منحرف ہونے کا پہلو اختیار نہ کریں۔ نوبہار کہتی ہے کہ اگر خدا کے کوئی بیوی ہوتی تو اُس کو معلوم ہوتا کہ چار بیویاں کیسی ہوتی ہیں۔ غرضکہ آپس میں خوب بحث ہوتی ہے اور اُس میں ایک نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ شہزادہ سیدزادہ ہے۔ اُس کی ازواج میں شامل ہونا ثواب میں داخل ہوتا ہے۔ یہ بات کہاں تک پہونچتی ہے ظاہر ہے ــــ اب اس مضمون کے اختتام پر مجموعی حیثیت سے اِس افسانہ پر نظر ڈالنا غیر موزوں نہ ہوگا۔ اپنے زمانہ کی معلوماتِ علمی پیش کرنے کی غرض سے مصنف نے افسانہ کی بنیاد کارخانۂ عالم کی تصویر مرتب کرنے پر اس طرح رکھی ہے کہ پہلے عناصر چارگانہ کا ذکر کیا ہے۔ پھر نظام فلکی کا۔ اور اُس کے بعد موکلانِ غیب (رب النوع یا سیاروں اور برجوں کے موکل) کے عمل اور اثر سے کارخانۂ عالم کا چلنا ظاہر کیا ہے۔ آخر الذکر یعنی رب النوع کے نظریہ کا سلسلہ آوِستا اور دیگر قدیم حکمائے ایران تک پہونچتا ہے اور اختر شناسی (Astrology) کی ذیل میں آتا ہے۔ یہ عالم کبیر کی تصویر ہے پھر عالم صغیر کی طرف رجوع کرکے مصنف جسم انسانی کی ترکیب و ترتیب ظاہر کرتا ہے۔ بعد ازاں کرۂ خاک کی جس پر انسان زندگی بسر کرتا ہے کیفیت ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ سب باتیں مذہبی عقاید کا پہلو بھی لئے ہوئے ہیں۔

یہ ہے ظاہری ترتیب۔ اگر معنوی مطالب حاصل کرنے کی طرف توجہ کی جائے تو سلسلہ وار اُنکی تفصیل کچھ اس طرح پائی جائیگی۔ کہ انسان جب دُنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اپنی سابقہ کیفیت اور اصل حقیقت کو بھول جاتا ہے اور دام مجاز میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ دینوی زندگی کے لئے مرحلۂ مجاز بھی ایک لازمی مرحلہ ہے جس کے طے کرنے کے لئے بڑی کوشش اور بڑی ریاضت کی ضرورت ہے۔ تجربہ اور حصولِ علم کے بغیر وہ منزلِ حقیقت کی جانب راہ نہیں پا سکتا۔ اور جب تک قوائے حیوانی کو اپنے قابو میں نہ کرلے اور عقل کے راستہ پر نہ چلے وہ اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اسرارِ حقیقت معلوم کرسکے۔ عالمِ مجاز عارضی ہے اور خود انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ حقیقت سے بہت دور ہوگیا ہے۔ مجاز سے اُسکی تسلی نہیں ہوتی اور وہ تلاشِ حقیقت میں بے چین اور مضطرب رہتا ہے۔ حقیقت پس پردہ ایسا راز ہے جس سے اہلِ عالم واقف نہیں۔ ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد۔ یا عیسٰی بدین خود اور موسٰی بدینِ خویش والا مضمون ہے۔ اس لئے ایک ہادی کی سخت ضرورت ہے جو سالک کے قلب، و دماغ کو علم و عقل کی روشنی سے منور کرکے اور اپنی روحانی قوت سے صحیح جادۂ عمل پر قایم رکھکر منزلِ مقصود تک پہونچائے۔

یہی تمثیل نگاری اور ادبی پہلو ہے جس کی بنا پر خیال ہوتا ہے کہ بوستانِ خیال، طلسم ہوشربا وغیرہ سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ لیکن اُس کو اس نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

ح - ا

ایشیا اور اشتراکیت

اس وقت ایشیا میں ہر جگہ انقلاب کے آثار نمایاں ہیں۔ سلف گورنمنٹ اور اقتصادی و معاشرتی خوش حالی کا مطالبہ کرنا، کسانوں کا زمین کو اپنی ملکیت کہنا، انڈسٹری کو سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکال کر عوام کے ہاتھ میں دیدینا ۔۔ یہ ہے وہ عام فضا جو ایشیا میں ہر جگہ نظر آرہی ہے۔

پھر اگر یہ سب روس کا کرا دھرا نہ ہو، تو بھی اس میں شک نہیں کہ وہ ان حالات سے فایدہ ضرور اٹھانا چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پچھلے سال فروری، مارچ میں جو کانفرنس جنوبی مشرقی ایشیا کے نوجوانوں کی کلکتہ میں ہوئی تھی اسکے پیچھے روس کا ہاتھ تھا اور اسی کی ہدایات اسے مل رہی تھیں، چنانچہ اسی کے بعد نہرو حکومت کی مخالفت میں آواز بلند کیگئی ملایا، برما اور سیام میں بے چینی پیدا ہوئی اور بنکاک و رنگون کے روسی سفارت خانوں میں نیا اسٹاف مقرر کیا گیا۔

اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ روسی ایجنٹ ہر جگہ کام کر رہے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ایشیا کے اس حصہ میں کمیونسٹ تحریک پھیلنے کی وجہ سے روس کو بہت توقعات قایم ہو گئی ہیں۔

چین ایشیا میں کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا کامیاب مرکز چین ہے اور خود امریکہ و برطانیہ کے غیر کمیونسٹ افراد جو شمالی چین میں رہتے تھے انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ چین کی تاریخ میں ایسی اچھی حکومت اس سے قبل کبھی نہ ہوئی تھی۔ منچوریا تو خیر سوویٹ اثر میں آہی گیا تھا لیکن اب چین کا بھی ایک تہائی سے زیادہ حصہ کمیونسٹ فوجوں کے قبضہ میں آگیا ہے۔

ملایا چینی آبادی کا بڑا حصہ ملایا میں بھی ہے اور یہاں جو خانہ جنگی جاری ہے اس میں چینی کمیونسٹوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سرمایہ داروں کے خلاف یہاں بھی بڑی زبردست تحریک پائی جاتی ہے اور چینیوں کا غریب، مزدوری پیشہ طبقہ سب کا سب کمیونسٹ جھنڈے کے نیچے آگیا ہے۔

ہندوستان یہاں مزدوروں کی بے چینی اتنی عام تو نہیں ہے پھر بھی کمیونسٹ اثر جب چاہتا ہے لاکھوں مزدوروں سے اسٹرایک کرا دیتا ہے۔ یہاں کی کمیونسٹ جماعت پنڈت نہرو کی اس صلح پسند پالیسی کی سخت مخالف ہے جو یہاں کے سرمایہ داروں کے لئے اختیار کی گئی ہے۔

ہر چند اس وقت سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں نے مل کر کوئی متحدہ محاذ حکومت کے خلاف قایم نہیں کیا ہے، لیکن

چونکہ نوجوان طبقہ اشتراکیت کی طرف زیادہ مایل ہے اس لئے اس کا مستقبل کافی روشن ہے اور اب بھی کانگرس کے بعد کمیونسٹ پارٹی ہی سب سے بڑی جماعت سمجھی جاتی ہے۔

برما یہاں کی حکومت بائیں بازو کے ہاتھ میں ہے اور اس کے لیڈروں کی تقریروں سے (جس میں تھاکن نو وزیر اعظم بھی شامل ہیں) روس کی طرف ان کے میلان کا کھلا ہوا پتہ چلتا ہے۔

سیام - سیام کی راجدھانی بنکاک وسط ایشیا کے کمیونسٹ تحریک کا مرکز ہے اور گو حکومت یہاں ابھی تک دائیں بازو ہی کی ہے لیکن کمیونسٹوں کے مسلح مقابلہ کی وجہ سے اس کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

انڈوچائنا یہاں سب سے پہلے نیشنلسٹ تحریک شروع ہوئی تھی، لیکن فرانس نے یہاں کے قومی مطالبات کو رد کر کے اس تحریک کو کمیونسٹ تحریک میں تبدیل کر دیا - اور آخر کار خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں کمیونسٹ جماعت بڑی دلیری سے فرانسیسی حکومت کا مقابلہ کر رہی ہے۔

انڈونیشیا یہاں کی حالت بھی انڈوچائنا کی سی ہے۔ جاپانی فوجوں کے جانے کے بعد جب پھر ڈچ حکومت واپس آئی تو اس نے یہاں کی قومی حکومت کے مطالبات کی پروا نہیں کی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں کمیونسٹ جماعت کو کافی اقتدار حاصل ہو گیا۔ الغرض اس وقت ایشیا میں اشتراکی تحریک نہایت قوت کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے اور اس کو دبانا ممکن نہیں، اس لئے اگر روس براہ راست اس سے فایدہ نہ اٹھانا چاہے تو بھی اس تحریک کا ردِ عمل وہی ہوگا جو روس چاہتا ہے۔

شہوانیات کیا ہے؟

منجملہ ۱۲۴ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں:-

فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا — شادی، طلاق و خلع — مذہبی فحاشیاں
فحاشی پر عمومی تبصرہ — استلذاذ بالمثل — استلذاذ بالنفس — استلذاذ بالوحوش
فحاشی عہدِ قدیم میں — فحاشی قرون وسطی میں — عہد جدید اور فحاشی — اخلاقِ جنسی

جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع، تاریخی، علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا۔ حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے۔

حجم ۲۱۶ صفحات - کاغذ سفید و دبیز - قیمت علاوہ محصول چار روپیہ — منیجر نگار لکھنؤ

دُنیا بدل رہی ہے

کل اتفاقیہ یہ الفاظ مجھے سنائی دئے۔ میں حسب دستور اپنے مکان کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک نئی عمارت بن رہی تھی۔ مزدوروں نے لکڑی اور بانس کا بڑا اونچا مچان بنایا تھا دو دو تین تین بھاری بھاری پتھر سر پر رکھے ہوئے تھے۔ میں انھیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا...... میں سوچ رہا تھا کہ "کیا اس مکان، اس مچان، ان مزدوروں کی طرح ہم سب اس سنسار میں اپنی بلندی دوسروں کی بلندی کے لئے بناتے ہیں؟...... کیا آتش بازی کی ہوائی کی طرح ہم سب محض اس لئے اوپر اڑتے ہیں کہ نیچے والے ہمیں دیکھ کر خوش ہوں؟...... اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے:-

"دُنیا بدل رہی ہے"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرا دوست ہاتھ میں ایک اخبار لئے ہوئے کھڑا تھا، آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر ویسی ہی ہنسی جیسی بالک بچپنے میں ہنستے ہیں ——— کہنے لگا "جانتے ہو یہ کیا بن رہا ہے؟ یہاں بے تار کی خبر رسانی کا اسٹیشن ہوگا ولایت کے گانے، امریکہ کی تقریریں یہاں سنائی دیں گی ——— دُنیا بدل رہی ہے ———"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں جب کبھی "بیسویں صدی" "نیا زمانہ"، "نئی دُنیا"، "نئے خیالات" اور اسی سانچے کے ڈھالے ہوئے دوسرے الفاظ سنتا ہوں، تو بے اختیار ہنس دیتا ہوں۔ میں نے جواب دیا "ہاں! پرانی آتما نیا روپ لے رہی ہے، پرانے چھلکے پر نیا چھلکا چڑھ رہا ہے، لیکن گودا وہی ہے جو ویدوں کے زمانہ سے پہلے تھا۔" میرے دوست نے اپنی عادت کے موافق بڑے زور سے قہقہہ لگایا کہنے لگا۔ تم نے تو دُنیا تج دی ہے۔ جگ کے الٹ پھیر تم کیا جانو؟ کل صبح زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گا، تب تم کو معلوم ہوگا کہ ہماری دھرتی کروٹ لے رہی ہے یا نہیں" یہ کہا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔

میں دور تک اسے دیکھتا رہا، کیسے بے فکر اور بھولے لوگ ہیں؟ ایک جیب میں ولایتی سونا ہے۔ دوسرے میں دیسی کسوٹی اسے اس پر کستے ہیں۔ زرد لکیر دیکھ کر اسے کندن سمجھتے ہیں۔ اصل بدلنا تو کسوٹی کا ہے! اور پھر مکان، مچان اور مزدوروں کی دھن میں لگ گیا۔ یہ دو ہاتھ، دو پاؤں کے پتلے اسی طرح اپنی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ نیچے سے اوپر لے جا رہے تھے۔

آج میرا دوست مجھے دن بھر شہر میں ادھر ادھر پھراتا رہا۔ اس نے مجھے نئی نئی عمارتیں دکھائیں، پرانے اینٹ پتھر

کے نئے استھان ! پُرانی آتما کے نئے چولے !! " یہ نئی سڑک ہے" اس پر ٹریم چلے گی"۔۔۔۔ " یہ نیا بنک گھر ہے" " یہ نئی دوکان ہے" یہ " نئے قسم کا مدرسہ ہے"۔۔۔۔۔ خدا معلوم کیا کیا بتا رہا اور باتیں کرتا رہا اور بہت خوش تھا، جیسے لڑکیاں ہنس ہنس کر اپنی سہیلیوں، سکھیوں کو پُرانی گڑیوں کے نئے زیور دکھاتی ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، آنکھیں نئے نئے روپ دیکھ رہی تھیں۔ کانوں میں اس کی آواز آرہی تھی، لیکن اندر والا گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح یہ کہہ رہا تھا " اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" جب تھک گیا تو کہنے لگا۔ " اب بھی قایل ہوئے کہ نہیں ! شانتی پور بدل رہا ہے" میں ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا۔

سامنے ایک حلوائی کی دوکان تھی۔ ترازو ہاتھ میں لئے ہوئے کچھ تول رہا تھا۔ میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر اُسے وہاں لے گیا۔ حلوائی سے کہا:۔ " لالہ دُنیا بدل رہی ہے، تم اپنے باٹ بدل دو" ہنسنے لگا، کہا:۔ " ہمارے یہاں اسی کا چلن ہے، گاہک نہیں مانتے۔۔۔۔۔" پھر ایک بزاز کے یہاں گئے، کپڑا ناپ رہا تھا، میں نے کہا " اپنا گز نہیں بدلیتے" اس نے منہ پھیر لیا۔۔۔۔۔۔ راستے میں ایک سپاہی ملا۔ اس کے ساتھ ایک بھلا مانس تھا، ہاتھ میں ہتھکڑی، آنکھ میں شرافت ! میں نے کہا جمعدار صاحب ! اسے کیوں پکڑا ہے ؟" کہنے لگا " اس نے اپنے بھوکے بچّوں کے لئے آٹا چُرایا ہے" میں نے کہا کیا کوتوال صاحب نے چوری کا معیار ابھی نہیں بدلا"۔ وہ مجھے بہت بُری نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا۔

تھوڑی دور چل کر ایک مکان میں پہونچے، ایک لکڑی کے تختے پر بڑے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا:۔ " سیٹھ اشرفی مل کا پُن خانہ" ہزاروں اپاہج اور نکمّے جمع تھے۔ زبردستی کے اپاہج ! کام کے نکمّے !! میں نے داروغہ سے پوچھا " بھائی انھیں خیرات کیوں دیتے ہو ؟" کہنے لگا " نیک کام ہے۔ سیٹھ کی دیا معلوم ہوتی ہے، فیاضی ہے" نیک کام ! دیا !! فیاضی !!! سب ہی پُرانے سانچے، کیا واقعی دُنیا بدل رہی ہے۔

پُرانے باٹ، پُرانا گز، پُرانا قانونی معیار، پُرانا اخلاقی معیار، دُنیا میں ہر طرف وہی پُرانی کسوٹی، اور اندر سے آتما کی وہی پُرانی گھڑی کی سی ٹک ٹک اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے"۔ میں نے اپنے دوست کی طرف غور سے دیکھا، اس نے آہستہ سے کہا " معلوم ہو گیا اب لوٹ چلو"۔

دھرتی آئے دن نیا سونا اُگلتی ہے۔ سنسار اپنا روپ نت نیا بدلتا ہے۔ پُرانے باٹ گھس گئے، پُرانے گز چھوٹے ہو گئے۔ بہت سے پُرانے جُرم ہلکے ہو گئے، پُرانی نیکیاں، بدیاں بنیں، پُرانی بدیاں نئے سانچوں میں ڈھلیں، پھر دُنیا اُنھیں کیوں نہیں بدلتی ؟ بالکوں کی طرح ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو کلیجے سے کیوں لگائے ہوئے ہے ؟ ست جگ کے ست کو

کلجگ میں بھی ست کیوں جانتی ہے؟ ایک پن خانہ بنا کر دس کی بنیاد کیوں رکھتی ہے؟ آج سانپ کی رکھشا کر کے کل نیولا کیوں پالتی ہے؟........ نئے کندن کے لئے نئی کسوٹی کیوں نہیں ڈھونڈھتی، وہی حلوائی کی بات ہے گاہک نہیں مانتے"

اب میرا دوست دھرتی کی کروٹ کا قایل نہیں رہا۔ میں اس سے کبھی کبھی ہنسی سے پوچھتا ہوں دنیا کب بدلیگی؟ اس سوال کو سن کر اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ آنکھیں پھیل کر ایسی ہو جاتی ہیں جیسے جیسے کوئی شام کے دھندلکے میں دور کی چیز دیکھ رہا ہو۔ وہ بہت دھیمی آواز سے جواب دیتا ہے: "جب گاہک مانیں گے"۔ (نئی روشنی۔ سید تاج الدین)

اُردو کا مقبول عام نیم ماہی مصوّر رسالہ

آج کل

دہلی سے ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے

آج کل کو ہندوستان کے بہترین لکھنے والوں کی قلمی اعانت کا فخر حاصل ہے بلحاظ حُسنِ کتابت وطباعت متنوع مضامین با ادبیت وافادیت آج کل ہندوستان کے بہترین رسالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رنگین سرورق اور تصویریں اس کی ظاہری زیب وزینت میں اور اضافہ کرتی ہیں

آج کل ہندوستان کے دور آزادی میں نئی امنگوں اور نئے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے: اس میں ہندوستانی کلچر کے متعلق مفید مقالے شائع کئے جاتے ہیں یا جچے تلے اور سُلجھے ہوئے ادب کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ سالنامہ جو ہر سال اگست میں شائع ہوا کرے گا خریداروں کو چندے ہی میں دیا جاتا ہے۔ سالانہ چندہ نو روپے

پبلکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی پوسٹ بکس ۲۰۱۱

یونیورسٹی سے لوٹتے ہوئے

سیاسی شعور ہماری زندگی میں سیاست اس قدر پیش پیش ہو گئی ہے کہ وہ لطف و سکونِ زندگی جو ہمیں ایک جابر و ظالم بادشاہ کے عہد حکومت میں حاصل تھا اب عنقا ہو گیا ہے۔ الیکشنوں کی ضرورت اس قدر زیادہ اور جلد جلد ہو گئی ہے کہ ہمارے سماج میں ہر وقت ایک بحران کی سی کیفیت رہتی ہے ایک مستقل بخار کی سی حالت جو کسی وقت کم ہو جاتا ہو کسی وقت زیادہ ہر الیکشن ہمارے اعصاب انفرادی اور اجتماعی دل و دماغ کے لئے گویا ایک زلزلہ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے سیاسی تفکرات ہمارا سیاسی فلسفہ ابھی کسی ایسے حل پر نہیں پہونچا ہے کہ یہ مسائل تمام سلجھ کر ایک متوازن شکل ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیں اور اس طرح ایک ڈھرا بندھ جائے یہی وجہ ہے کہ ہماری سیاست کے فلسفہ میں روز نئے نقطۂ نظر پیش ہوتے رہتے ہیں نت نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جس سے ایک عجیب انتشاری کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور جس نے ہماری زندگی کو مختل اور اعصاب زدہ بنا کر رکھ دیا ہے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی محض سیاسی زندگی نہیں ہے سیاست ہماری زندگی کا ایک پہلو ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہت اہم پہلو ہے، لیکن سیاست ہماری پوری زندگی نہیں۔ اس لئے سیاست کو ہماری زندگی پر اس قدر حاوی نہ ہونا چاہئے کہ ہمارے ہوش و حواس معطل ہو جائیں یا ہماری زندگی کے دوسرے گوشے دوسرے شعبے التوا ہی میں پڑے رہیں۔

یہ صحیح ہے کہ جب تک کوئی بات حل نہ ہو جائے انسانی دماغ پریشان رہتا ہے اور اس سوال کا حل اس کے تمام اعصاب پر ایک جنون کی سی صورت میں سوار رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ تمام سیاسی نظریے اور تفکرات ابھی تجربے کی منزل میں ہیں ابھی وہ کسی ایسے مقام پر نہیں پہونچے ہیں جہاں پہونچکر ہمارے دل و دماغ کو سکون ہو جائے اور یہ مسایل ہمیشہ کے لئے حل شدہ سمجھے جائیں نہ آسمانی صحائف ہی کوئی ایسے موجود ہیں جن میں یہ مسایل اپنی تمام موجودہ پیچیدگیوں کے ساتھ مختتم طور پر حل شدہ ہوں، اسلئے لامحالہ ہر چہار گوشۂ دنیا میں انسان ایک عجیب سیاسی انتشار و ہیجان سے دوچار نظر آتا ہے۔ کس قدر الجھن کی بات ہے!

مگر یہ الجھن تو رہے گی جب تک دنیا کے مدبرین اور مفکرین یکجا طور پر اور ہمیشہ کے لئے ان سیاسی تفکرات کو مختتم طور پر حل نہ کر لیں لیکن اس آخری منزل پر پہونچنے کے لئے ابھی بہت عرصہ نظر آتا ہے، کیونکہ آدمی کے لئے انفرادی طور پر کسی مختتم نتیجہ پر پہونچنے کے لئے بڑا زمانہ درکار ہوتا ہے جس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ لیکن کوشش بہر حال کرتے رہنا چاہئے۔

وہ حل چاہے جو کچھ ہو وہ آخری نتیجہ خواہ کسی صورت کا ہو لیکن ایک بات ضرور سامنے رکھنا پڑے گی اول تو یہ کہ ہماری زندگی میں سیاست کی اتنی اہمیت اور اس قدر زور و شور کو جو اسی صدی میں خصوصاً نمایاں رہا ہے کم کرنا پڑے گا۔

ہماری روزمرہ کی زندگی سکون اور اطمینان چاہتی ہے کیونکہ صحیح تمدنی علمی اور سماجی ترقیوں کے لئے سکون اور بے انتشاری ہے بھی بہت لازمی چیز- بغیر بے انتشاری کے کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں ہے اس لئے یہ بحرانی اور ہیجانی کیفیت جو سیاسیات کی غیر مناسب زیادتی سے ہماری زندگی پر چھا گئی ہے یقینی اور قطعی طور پر دور کرنا ہوگی- اس سلسلہ میں ہمیں ایک بات سے بڑی مدد ملے گی اگر ہم اُسے پیشِ نظر رکھیں اور یقیناً رکھنا چاہئے اگر ہم اس باب میں اعتدال چاہتے ہیں وہ یہ کہ ووٹ دہندگی کا حق آپ کو صرف اُن بالغوں کو دینا ہوگا جو اپنی عمر کی ایسی منزل پر پہونچ گئے ہیں کہ ان کا دماغ اپنی شہری اور سیاسی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھنے اور صحیح طور پر محسوس کرنے لگا ہے اس سلسلہ میں آپ کو علم النفس یعنی سائیکالوجی سے کام لینا پڑے گا۔ علم النفس میں ابھی تک کوئی باقاعدہ طور پر ایسا تجربہ تو نہیں کیا گیا ہے اس لئے فی الحال ہمیں اپنے تجربہ سے کوئی مدت عمر ووٹ دہندگان کی ایسی مقرر کرنا ہوگی جس پر ہم سمجھتے ہیں کہ اُس کا سیاسی شعور صحیح طور پر بالغ ہو جاتا ہے- ہمارا تجربہ ہمیں بتلاتا ہے کہ آدمی جب تک عمر کی تیس پینتیس منزلیں طے نہیں کرلیتا اس میں سیاسی شعور اور سماجی ذمہ داریوں کا احساس پورے شباب پر نہیں پہونچتا یعنی وہ تیس پینتیس سال کی عمر میں پورا شہری کہلایا جا سکتا ہے اور پختہ طور پر اپنی رائے رکھتا ہے محض پروپاگنڈہ یا محض کسی قسم کی تحریص یا خوف اُس کی رائے کو اپنی طرف مجبور نہیں کر سکتی اس لئے ہمیں ووٹ دہندگی کا حق صرف اُسی فرد کو دینا چاہئے جو عمر کی اس حد کو پار کر چکا ہو اس تعین عمر سے ووٹ دہندگان کی تعداد میں تو ضرور کمی آجائیگی (جس میں کوئی حرج نہیں ہے) لیکن یہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوگی جو صحیح طور پر سیاسی درک رکھتے ہیں- اب تک الیکشن میں حق ووٹ دہندگی صرف اُس شخص کو دیا جاتا رہا ہے جو جسمانی طور پر بالغ ہو گیا ہو لیکن یہ طریقہ غلط ہے- انسان دماغی طور پر پچیس سال کی عمر میں بالغ ہوتا ہے اور اُس کا سیاسی شعور پینتیس سال پر پہونچکر صحیح بلوغ پاتا ہے- صرف تیس یا پینتیس سال کی عمر والوں کے لئے حق نمایندگی منحصر کر دینے پر ہماری قومی مرضی تعداد کے بجائے تعقل، کثرت کے بجائے لیاقت پر مبنی ہو جائیگی اور یہی صحیح طریقہ ہے۔

دوسری بات جو عمر کے علاوہ اُتنی ہی اہم ہے تعلیم ہے- بغیر سیاسی یا سماجی یا کسی اعلیٰ قسم کی تعلیم کے ضروری نہیں ہے کہ محض عمر کی زیادتی کسی شخص میں صحیح طریقے پر سوچنے اور سمجھنے کا شعور پیدا کر سکے اس لئے تعلیم کا عام ہونا اول تو لازمی ہے تاکہ قوم کے ہر بالغ شخص کو اپنی دماغی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع مل سکے اور پھر انھیں تعلیم یافتہ اشخاص میں سے اُن افراد کو چن لیا جائے جو عمر کی تیس پینتیس منزلیں طے کر چکے ہوں- بغیر تعلیم کے جمہوریت کا تخیل ہی فضول ہے- ظاہر ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص کی رائے سیکڑوں جاہلوں کی رایوں کے مقابلے میں زیادہ وقعت رکھیگی اس لئے ہمیں اپنے انتخابات میں تعلیم کی شرط لگانا ضروری ہے- رائے طلب کرنے سے پہلے اہل الرائے بنانا ضروری ہے- رائے کا شمار اتنا ضروری نہیں جتنا کہ رائے کا تُلا ہوا ہونا۔

ایک پروفیسر

باب الاستفسار

محمود و ایاز

(جناب شمس الدین صاحب - ڈیرہ دون)

محمود و ایاز کی داستان محبت بہت مشہور ہے، لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ اسکی تاریخی حیثیت کیا ہے - کہیں ایسا تو نہیں کہ زیب النساء در عاقل خاں کے داستان محبت کی طرح یہ بھی شاعری ہو شاعری ہو -

---

(نگار) محمود اور ایاز دونوں تاریخی ہستیاں ہیں، اور ایاز کے ساتھ محمود کا شغف بھی تاریخی حقیقت ہے، لیکن اس محبت کی نوعیت اور اس کا سبب متعین کرنے میں غالباً شاعری سے زیادہ کام لیا گیا ہے -

ایاز، محمود کا غلام تھا اور نہایت محبوب غلام، لیکن اس لگاؤ کا تعلق امرد پرستی سے نہ تھا بلکہ صرف ایاز کی سلیقہ شعاری اور تہذیب و شائستگی سے - چنانچہ خود ہماری روز کی زندگی کا تجربہ ہے کہ جب کوئی ملازم ہمارا مزاجداں ہو جاتا ہے تو ہم بسا اوقات اس کی جھڑکیاں بھی برداشت کر لیتے ہیں اور بعض صورتوں میں تو آقا و نوکر کی تفریق بھی باقی نہیں رہتی -

پھر چونکہ ایاز بھی نہایت مہذب و شائستہ شخص تھا اور محمود کے مزاج میں بہت درخور حاصل ہو گیا تھا اس لئے محمود کا اس سے محبت کرنا بالکل فطری بات تھی، لیکن اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی تھی جس نے ایاز کو محمود کی نگاہوں میں بہت عزیز بنا دیا تھا اور وہ یہ کہ محمود در اصل ایاز کی بہن سے محبت کرتا تھا اور یہ محبت اس حد تک بڑھ گئی کہ آخر کار اس نے اس سے شادی کر لی - اس لئے ایاز، محمود کا خادم ہی نہ تھا بلکہ برادر نسبتی بھی تھا اور ایک محبوب بیوی کے بھائی ہونے کی حیثیت سے وہ اس کی بڑی نازبرداری کرتا تھا -

محمود کے اس واقعۂ عشق و محبت کا حال محمد عوفی نے جامع الحکایات میں بہت تفصیل سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

ایاز کی ایک بہن تھی جو حد درجہ حسین ہونے کے ساتھ ہی بڑی خوش ادا بھی تھی - محمود اس پر فریفتہ ہو گیا، لیکن اس خیال سے کہ وہ بدنام نہ ہو جائے اس راز کو عرصہ تک کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا - جب یارائے ضبط نہ رہا تو اسنے

ایک رات ابو نصر مشکانی سے جو اس کا نہایت معتمد علیہ امیر تھا، سارا حال کہہ سنایا۔ ابو نصر نے شادی کرنے کا مشورہ دیا تو محمود نے کہا "کہ اس کا اثر میری رعایا پر خراب پڑے گا اور قرب وجوار کے فرمانروا مجھے ذلیل سمجھنے لگیں گے"

ابو نصر نے کہا کہ "تاریخ کا یہ کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا۔ آلِ سامان کے بہت سے بادشاہوں نے کنیزوں سے شادیاں کی ہیں، اور بہرام گور نے تو ایک ماہی گیر کی لڑکی سے عقد کر لیا تھا، ایاز کی بہن تو پھر بھی بہت معزز ہے"

یہ سُن کر محمود کو بڑا اطمینان ہوا اور اس نے دوسرے ہی دن ایاز کی بہن سے شادی کر لی۔

ہوا کا دباؤ

(جناب عبدالعلی صاحب۔ فیض آباد)

ہوا کا دباؤ بہت مشہور بات ہے اس کی کیا حقیقت ہے اور بیرومیٹر پر اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں۔

(نگار) ہوا کا دباؤ، سطح زمین پر پندرہ پونڈ فی مربع انچ ہے اور بیرومیٹر (مقیاس الہوا) میں اس دباؤ کا اثر پارہ کو ۳۰ انچ تک پہونچا دیتا ہے۔ جس قدر آپ سطح زمین سے بلند ہوتے جائیں گے، ہوا کا دباؤ کم ہوتا جائے گا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر ہزار فیٹ کی بلندی پر مقیاس الہوا کا پارہ ایک انچ نیچے اُتر آتا ہے اور نصف پونڈ فی مربع انچ دباؤ کم ہو جاتا ہے۔

مقیاس الہوا نام ہے ایک شیشہ کی نلکی کا جس کی لمبائی ۳۱ انچ سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے اور اس کے نچلے حصہ کی صورت گول قمقمہ کی سی ہوتی ہے جس میں پارہ بھرا رہتا ہے اور وہ ہوا کے دباؤ سے اوپر کی طرف چڑھتا ہے۔

سمندر کی سطح پر یہ دباؤ پارہ کو ۳۰ انچ تک پہونچا دیتا ہے، لیکن ایک میل کی بلندی پر پانچ انچ کم ہو کر ۲۵ انچ رہجاتا ہے اور ۶ میل کی بلندی پر صرف ۹½ انچ۔ بیرومیٹر کے ذریعہ سے ہم پہاڑوں کی بلندیوں کو بھی ناپ سکتے ہیں اور وہ اس طرح کہ اگر ہم کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر یہ دیکھیں کہ بیرومیٹر کا پارہ گھٹ کر ۲۰ انچ تک آگیا ہے تو ہم سمجھیں گے کہ بلندی دس ہزار فیٹ ہے، کیونکہ ہر ہزار فٹ کی بلندی پر پارہ ایک انچ کم ہو جاتا ہے۔

ہوا کا دباؤ بدلتا رہتا ہے، کیونکہ گرم ہوا ٹھنڈی ہوا سے اور مرطوب ہوا خشک ہوا سے زیادہ ہلکی ہوتی ہے، اس لئے جب ہوا ٹھنڈی اور خشک ہوتی ہے تو اس کا دباؤ اپنی انتہا کو پہونچ جاتا ہے اور جب وہ گرم و مرطوب ہوتی ہے تو دباؤ بہت کم ہو جاتا ہے۔

علمی و تاریخی جھلکیاں

عصائے ہارون انگریزی فن تعمیر میں "پھول پتیاں" بنانے کو "Aaron's Rod" کہتے ہیں۔ اسکا تعلق ایک مذہبی تلمیح سے ہے۔

"Aaron" اور ہارون ایک ہی چیز ہیں۔ ہارون بہ روایت عیسوی مذہب موسیٰ کے بھائی تھے اور جب موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باہر لائے ہیں تو یہ بھی ان کے معاون تھے اور چونکہ موسیٰ کی زبان لکنت کرتی تھی، اس لئے ہارون ان کی ترجمانی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ جب موسیٰ اپنی قوم کو مصر سے نکال کر صحرا سینا میں لائے تو ہارون بھی ساتھ تھے، لیکن جب موسیٰ کوہ سینا چلے گئے تو ان کی غیبت میں ہارون نے بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل سے اسکی پرستش کرائی، موسیٰ جب لوٹ کر آئے اور یہ حال معلوم ہوا تو بہت خفا ہوئے اور انھوں نے ہارون کو نکال دیا لیکن عین اسی وقت جبکہ ہارون کے خلاف لوگوں میں شورش برپا تھی ان کی حقانیت کے ثبوت میں ان کے عصا میں جو بادام کا تھا دفعتاً پھول نکل آئے، فن تعمیر میں گلکاری کا اصطلاحی نام (Aaron's Rod) (عصائے ہارون) اسی تلمیح سے تعلق رکھتا ہے۔

نقش و تعویذ یونانیوں کے یہاں رواج تھا کہ لفظ Abraxas کو انگوٹھیوں اور دوسرے زیوروں پر کندہ کرا کے دفع بلا کے لئے پہنتے تھے۔ یہ لفظ چند یونانی حروف کا بے معنی مجموعہ ہے جن کے اعداد ۳۶۵ ہوتے ہیں اور یہ عدد بہت مبارک خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس کا رواج ابتدائے عہد عیسوی میں ہوا اور عہد وسطیٰ تک اتنا عام ہو گیا کہ اس نقش کی تختیاں عام طور پر استعمال ہونے لگیں۔

کیمیا اور علم الکیمیا اول اول کیمیا کا تعلق بھی سحر و افسوں سے تھا اور غالباً سب سے پہلے مصریوں کو اس کا شوق ہوا کیونکہ انھیں یقین تھا کہ بوٹیوں کی مدد سے معمولی دھات کو بھی چاندی یا سونا بنایا جا سکتا ہے، چنانچہ قدیم مصر کے ماہر کیمیا ہرمس ٹرسمگسٹس نے ایک کتاب بھی اس موضوع پر لکھی تھی۔ اسی سلسلہ کی چیز پارس کا پتھر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے مس کرنے سے معمولی دھات سونا بن جاتی ہے، ہرمس پارس پتھر کو ایک انڈا بتاتا ہے

کلدانی دھاتوں کو سات سیاروں سے منسوب کرتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہر دھات پر ایک مخصوص سیارہ اثر انداز ہوتا ہے۔ یونانیوں نے اس علم کا مطالعہ تحقیق عناصر کے سلسلہ میں کیا لیکن اس کی ترقی یونان میں محض عربوں کی وجہ سے ہوئی جب انھوں نے مصر کو فتح کیا اور اسکندریہ میں اپنے علوم و فنون کی روشنی پھیلائی، لیکن اب اس علم کا نام

کیمیا نہ رہا جس کا مقصود سونا بنانا تھا، بلکہ علم الکیمیا ہو گیا جسے Chemistry کہتے ہیں اور اب اس فن نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ علوم حکمیہ میں سے کوئی علم ایسا نہیں ہے جو اس کا محتاج نہ ہو اور سائنس کی کوئی ایجاد ایسی نہیں جو اس علم سے تعلق نہ رکھتی ہو۔

بابل عہد قدیم کی بڑی زبردست سلطنت تھی۔ ارضِ بابل کو ارضِ کلدانیان بھی کہتے ہیں۔ یہ حکومت دجلہ و فرات کے درمیانی حصۂ زمین میں قایم تھی (جسے اب عراق کہتے ہیں) کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد مسیح سے نو ہزار سال قبل پڑ چکی تھی، لیکن لیکن ۴۰۰۰ قبل مسیح سے پہلے کے حالات ہمیں معلوم نہیں ہیں۔ یہ سرزمین اول اول شہری حکومتوں میں منقسم تھی، یعنی ہر شہر کی حکومت الگ تھی، ان شہروں میں خاص خاص یہ تھے:۔ عکاد۔ لگاش۔ اُر۔ کیش۔ اریچ۔ سپار۔ اوپس۔ اُما اور اواب۔ ان میں سب سے زبردست سارگون (اکاد کا فرمانروا) تھا جو مسیح سے ۲۸۰۰ سال قبل پایا جاتا تھا۔ یہاں کی آبادی سمیریوں کی تھی اور انھیں کی وجہ سے اس حکومت میں تہذیب پھیلی۔

جس حکومت کو حکومتِ بابل کہتے ہیں وہ در اصل مسیح سے ۲۳۰۰ سال قبل وجود میں آئی اور ۵۳۹ قبل مسیح تک قایم رہی۔ اس کے پہلے حکمراں خاندان میں حمورابی بڑا مشہور مقنن بادشاہ ہوا ہے، جس نے شہر نینوا کی بنیاد ڈالی اور اپنی فتوحات سے ملک کو بہت وسیع کر لیا۔ اس خاندان کے بعد اور خاندانوں نے بھی حکومت کی لیکن ۱۲۰۰ قبل مسیح تک اس میں زوال شروع ہو گیا۔ بخت نصر اول کے زمانہ میں (۷۰۰ سال قبل مسیح) پھر حکومت میں کچھ جان آئی ——— لیکن اسیریا کو جو ایک علحدہ حکومت قایم ہو چکی تھی، حکومتِ بابل میں وہ بھی پھر شامل نہ کر سکا۔ بخت نصر ثانی کے زمانہ میں جس کا ذکر بائبل میں ہے زوال کی افتاد کچھ دنوں کے لئے رک گئی، لیکن ۵۳۹ قبل مسیح میں اہلِ فارس نے حملہ کر کے اس حکومت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

بابل کی حکومت نے اپنے عالیشان مکانوں اور ترقی علوم و فنون کے وجہ سے بہت شہرت حاصل کی۔ مذہبًا اہلِ بابل بت پرست تھے اور بعل ان کا خاص بُت تھا۔

اسیریا قدیم زمانہ میں ساحل دجلہ پر ایک شہر آباد تھا، اس کا نام آشور تھا۔ اسی کے چاروں طرف کا علاقہ اسیریا کی سلطنت میں شامل تھا۔ یہاں کی آبادی سامی قوم کی تھی (سام، نوح کے بیٹے کا نام تھا اور اسی کا سلسلۂ اولاد سامی کہلاتا ہے) اور اہلِ بابل سے تعلق رکھتی تھی۔ ان پر جو بادشاہ حکومت کرتے تھے وہ مذہبی رہنما بھی ہوتے تھے۔ ان کا مذہب وہی تھا جو اہل بابل کا۔ بتوں کو پوجتے تھے اور ان پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔

۲۵۰۰ سال قبل مسیح اسیریا کی حکومت بابل کی ماتحت تھی لیکن ۱۴۰۰ قبل مسیح میں وہ خود مختار ہو گئی، بلکہ کچھ دنوں کے لئے بابل پر بھی اس کا اقتدار قایم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلسل ۸۰۰ سال تک اسنے حطیوں (Hittites) اور

لہ حتّی، قدیم ایشیاے کوچک کی ایک قوم تھی اور کسی زمانہ میں یہاں ان کی زبردست حکومت قایم تھی۔ اس حکومت کا زمانہ ۲۰۰۰ء قبل مسیح تھا جو ۸۰۰ سنہ قبل مسیح تک بالکل ختم ہو گئی۔

دوسری سرحدی قوموں کے خلاف جنگ کرکے اپنے علاقہ کو بہت وسیع کرلیا، لیکن حکومت بابل کی سی وسعت اسے پھر بھی نصیب نہ ہوئی۔ یہاں کے فرمانرواؤں میں تگلات پلیزر اول بڑا زبردست بادشاہ ہوا ہے۔ اس کا زمانہ مسیح سے ۱۱۰۰ سال پہلے کا تھا۔

اس کے بعد حکومت اسیریا میں انحطاط شروع ہوا، لیکن ۷۰۰ سال قبل مسیح تگلات چہارم کے زمانہ میں پھر اس نے ترقی کی اور فلسطین، شام، اور عرب کا ایک حصہ فتح کرلیا۔ اس کے بعد مصر پر بھی قبضہ ہوگیا۔ بابل اور پورا عراق پہلے ہی فتح ہوچکے تھے لیکن اس ترقی کے بعد زوال بھی جلد ہی شروع ہوگیا اور حکومت مختلف فرمانرواؤں میں بٹ گئی، اس طرح مصر بھی خود مختار ہوگیا اور بابل بھی اور دوسرے حصوں کے فرمانروا بھی آزاد ہوگئے، اس تفریق کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۱۲ء قبل مسیح میدیوں[1] نے حملہ کرکے اسیریا کی سلطنت کو ختم کردیا۔

نینوا کے کھنڈروں سے اسیریا کی تہذیب پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے اچھے صناع تھے، چاندی سونے کا نہایت عمدہ کام بناتے تھے، نفیس کپڑا بُن سکتے تھے اور اچھے اچھے ظروف طیار کرتے تھے۔ ان کو تجارت کا بھی بڑا شوق تھا اور ان کے بینک بھی قایم تھے۔ یہ اپنی کتابیں اینٹوں پر لکھتے تھے اور کتب خانوں میں محفوظ کردیتے تھے۔

فن تعمیر کے یہ بڑے ماہر تھے اور ان کی عمارتیں حد درجہ شاندار ہوتی تھیں۔ یہ اپنے مکانوں، معبدوں اور مقبروں کو نقش و نگار سے آراستہ کرتے تھے، چنانچہ نینوا کے کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا شہر تھا اور بڑی بڑی شاندار عمارتیں رکھتا تھا۔ اس وقت جس مقام کا نام خورساباد ہے یہی کسی وقت سرگین، سارگن شاہ اسیریا کا پایۂ تخت تھا۔ یہ بادشاہ بڑا زبردست فاتح تھا اس نے ۷۰۵ء قبل مسیح میں انتقال کیا اور اس کا بیٹا سیناخرب تخت نشین ہوا۔ اس کے پایۂ تخت کے کھنڈروں سے بھی بڑی بڑی عمارتوں کا پتہ چلتا ہے۔

انگریزی کے علامات وقف

انگریزی میں علامات وقف کے لئے حسب ذیل علامات پائی جاتی ہیں:۔
کاما (،) — سمی کولن (؛) — ڈیش (—) اور علامت استفہام (؟) —

ان علامات کی کیا اصلیت ہے اور یہ انگریزی زبان میں کہاں سے آئیں، اس کے متعلق برٹانیکا میں لکھا ہے کہ "ان کی اصلیت کا پتہ نہ یونانی تحریروں سے چلتا ہے نہ لاطینی تحریروں سے، کیونکہ ان زبانوں میں جو علامات مستعمل تھیں وہ ان سے بالکل جدا تھیں"۔

قدیم انگریزی کتابوں میں بھی ان علامات کا پتہ نہیں چلتا، اس لئے محققین فکر میں تھے کہ ان کی اصلیت معلوم کریں۔ اس سلسلہ میں عرصہ ہوا مولوی نظام الدین حسن صاحب نے جو لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے اور بعد کو حیدرآباد میں جج ہائیکورٹ

---

[1] یہ قوم بھی ایشیاء کوچک سے تعلق رکھتی تھی لیکن بعد کو فارس تک پھیل گئی۔ دارائے اعظم، اسی قوم کا مشہور بادشاہ جس کا ذکر بائبل میں بھی پایا جاتا ہے۔

ہو گئے تھے ثابت کیا تھا کہ یہ تمام علامات عربی سے لی گئی ہیں جو سنہ ۷۱۱ء اور سنہ ۱۴۹۱ء کے درمیان ہسپانیہ میں عربی رسم خط میں پائی جاتی تھیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ کاما (و) عربی لفظ وقف سے نکلا ہے یعنی ٹھہراؤ کے جگہ بجائے وقف لکھنے کے صرف اسکے پہلا حرف واؤ لکھ دیتے تھے۔

واوین (" ") کا رواج بھی عربی رسم خط میں بالکل اسی موقعہ پر ہوتا تھا جس موقعہ پر انگریزی میں ہوتا ہے۔

سمی کولن انگریزی میں اس طرح (ف) لکھا جاتا ہے۔ یہ بھی عربی کے "نصف وقف" سے لیا گیا ہے۔ نقطہ نصف کے نون کو ظاہر کرتا ہے اور و، وقف کا پہلا حرف ہے۔

ڈیش (—) انگریزی میں ایک فقرہ کو دوسرے فقرہ سے علٰحدہ یا قطع کرنے کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں ایسے موقعہ پر بت لکھا جاتا تھا اور انگریزی کا ڈیش (—) اسی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ انگریزی کا بریکٹ [ ] بھی عربی سے لیا گیا ہے، جسے قوسین کہتے ہیں اور عربی میں مستعمل تھا۔

اللہ رے حزم و احتیاط!

ایک مرتبہ تین کچھوے، جن میں دو بڑے اور ایک چھوٹا تھا، ایک آبدار خانہ میں اپنی پیاس بجھانے گئے اور عشبہ کا ایک پیالہ طلب کیا۔ جب وہ پینے لگے تو ایک بڑے کچھوے نے کہا کہ "پانی برسنے والا ہے اور چھتریاں گھر پر بھول آئے ہیں، اب کیا کیا جائے" گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ چھوٹا کچھوا جاکر لے آئے، اس نے کہا کہ "میں چلا تو جاؤں، لیکن تم میرے عشبہ کا پیالہ پی لوگے"۔ اس کے ساتھیوں نے کہا "تم اطمینان رکھو، ایسا نہیں ہو سکتا، جب تم لوٹو گے تو تمہارا پیالہ جوں کا توں تمھیں ملے گا" آخرکار وہ چلا گیا اور تین ہفتے گزرنے کے بعد بھی واپس نہ آیا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا کہ "آؤ اس کا پیالہ بھی ختم کردیں، اب وہ کیا آئے گا"۔ اتنے میں دروازہ سے آواز آئی کہ "دیکھو اگر تم نے ایسا کیا تو میں چھتریاں لینے نہ جاؤں گا"۔

کشمیر کے مسئلہ میں بھی ہندوستان، پاکستان اور یو۔ ان کمیشن کا کچھ ایسا ہی حال ہے!

یہ بادل !

یہ نجم و ماہ و ثریا کی آنکھ کا کاجل،
یہ موتیوں کے جزیرے، یہ نور کے مدفن
یہ بجلیوں کے نشیمن، ہوا کے یہ گہوارے
یہ ماہ و سال کے بے آذر و صنم ہیکل
وہ بت کہ جن کو تراشا ہے نم فضاؤں نے
سرودِ حافظ و خیام کے یہ افسانے
کسی دیار کے آنسو، کسی حریم کے خواب
بجھے بجھے سے خیالوں کی راکھ اُڑتی ہوئی

جبال و دشت کے دامن میں قافلوں کے ہجوم
غریب خانہ بدوشوں کے چاک پیراہن،
یہ کھیتیوں کا ہلاہل، یہ میکدوں کی شراب
برغمِ کج کلہی یہ کسان کی تقدیر
یہ آنسوؤں کی دُعا، بھوک کی مناجاتیں
غم و الم کے اندھیروں میں قہقہوں کے یہ شہر
شفق کی نہر یہ سونے کے جال بنتے ہوئے
سروں پہ بارِ مہ و کہکشاں اُٹھائے ہوئے
افق کے دوش پہ یہ صبح و شام کے انبار
وہ دیکھ ہاتھ ہوئے عصمتوں کی سمت دراز
وہ سُلگی چھت، وہ گرے ٹوٹ کر در و دیوار
وہ تن برہنہ سی شہزادیوں کی ایک قطار
وہ راستوں میں برہنہ جلوس چلنے لگے

یہ پربتوں کی قبائیں، یہ نیل کے آنچل
یہ آفتاب کی تربت، یہ چاندنی کے کفن
یہ آسمان پہ دریائے نیل کے دھارے
ہوا کی موج سے گرتے ہوئے سنہرے محل
کیا ہے سجدہ جنھیں بھیگتی ہواؤں نے،
ہوا کے دوش پہ اُڑتے ہوئے سے میخانے
بتانِ مصر و عجم کے سیاہ رنگ نقاب
جنوں کی سمت خرد بے حجاب مڑتی ہوئی

رواں دواں سے مسافر بہ سمت نا معلوم
پھٹے ہوئے سے گریباں پھٹے ہوئے سے کفن
گرجنے والے جہنم، برسنے والے عذاب !!
یہ برق و باد کی نیت، یہ موسموں کا ضمیر
یہ کھیتیوں کے سلگتے سہاگ کی راتیں،
یہ قصر و بام کا امرت، یہ بھوک پیاس کا زہر
قمر کے تھال سے تاروں کے پھول چنتے ہوئے
دلوں میں چشمکِ برق و شرر چھپائے ہوئے
بنا رہے ہیں یہ بادل عجیب نقش و نگار !
وہ آئی قلعۂ شاہی سے چیخ کی آواز !
وہ جلتی لاشوں سے اُٹھنے لگے سیاہ غبار !
وہ دور ساکت و مبہوت، اک قطب مینار !
وہ دخترانِ حرم کے نقاب جلنے لگے !

بجھی وہ دیکھ ہواؤں سے صبح کی مشعل،
سیاہ پوش ہوا دور ایک تاج محل!

یہ بھاگتے سے حوادث، یہ دوڑتے مہ و سال
جمے ہوئے سے تصور، اڑے ہوئے سے خیال

یہ کہہ رہے ہیں ترے صبح و شام کچھ بھی نہیں،
کہ ملتوں میں مقامِ غلام کچھ بھی نہیں!

اسیر ہوں تو "امیر و امام" کچھ بھی نہیں،
جہاں میں حلقہ بگوشوں کے نام کچھ بھی نہیں!

یہ "صبح" گرمِ سفر ہے، یہ "شام" گرمِ سفر،
جہانِ "نجم و قمر" ہے تمام گرمِ سفر

بدل چکا ہے زمانہ رخِ حیات بدل
حوادثات کی نبضوں کو دیکھتا ہوا چل!!

پروفیسر شور

ملاح

پس منظر:- اٹھتا ہوا طوفان - ڈوبتی ہوئی کشتیاں، گاتے ہوئے ملاح:-

یہ گاتے زلزلے، یہ ناچتے طوفان کے دھارے
ہوا کی نیتوں سے بے خبر ملاح بیچارے!

وہ طوفانوں کے ہل چلنے لگے سیال کھیتی میں
وہ کشتی آ کے ڈوبی گوہریں قطروں کی ریتی میں!!

وہ ٹوٹیں موج کی شفاف دیواریں سفینوں پر
وہ پھر لہریں ابھر آئیں ارادوں کی جبینوں پر!

وہ ٹکرانے لگی آواز نیلے آسمانوں سے
وہ خطِ رہگزر پر جل اٹھیں شمعیں ترانوں سے

ہوائیں تھم نہیں سکتیں، تلاطم رک نہیں سکتے
مگر "موج و ہوا" کے سامنے سر جھک نہیں سکتے

سفینے ہیں کہ طوفاں کے تھپیڑے کھائے جاتے ہیں
مگر ملاح گیت اپنے برابر گائے جاتے ہیں

ہیں کتنے غم کہ جن کی مے سرور انگیز ہوتی ہے
ہیں کتنے گیت جن کی لو ہوا سے تیز ہوتی ہے!!

کھنچا ہو جن کا خطِ رہگزر طوفاں کے دھاروں پر
بڑی مشکل سے ان کو نیند آتی ہے کناروں پر!!

پروفیسر شور

نبض دوراں

پروفیسر شور کی بصیرت افروز نظموں کا مجموعہ بہت جلد شایع ہونے والا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

پروفیسر شمس شیدائی :-

گلاب و بادہ کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
اُبل رہی ہے صراحی چھلک رہے ہیں ایاغ

عبث شکایتِ بلبل ہے باغباں تجھ کو
دیا ہے نکہتِ گل ہی نے اُس کو گل کا سراغ

بدلتا رہتا ہے پیہم مرا دلِ بیتاب
کبھی ہے سنگ صفت اور کبھی مثالِ زجاج

کبھی ہے رہزنِ ایمان و ہوش و آگاہی
کبھی دلیلِ شبِ تار، مثلِ نورِ چراغ

کبھی کسی کے دمِ سرد سے فسردۂ و گل
کبھی گزرگہِ طوفاں میں جل اُٹھا ہے چراغ

کبھی ہے پردگیانِ فلک سے راز و نیاز
کبھی ملا نہ اُسے اپنی ہی خودی کا سراغ

نکل سکا نہ رہِ وادیٔ خرد سے حکیم
مرے جنوں نے دیا مجھکو دو جہاں سے فراغ

میں اپنے کیف و سرورِ حیات سے مخمور
شکایتِ غمِ دوراں کا اب کسے ہے دماغ

لگا دی آگ چمن میں بہار نے کیسی
کہ سوزِ لالہ و گل سے بھڑک اُٹھا ہے باغ

تبسمِ لبِ لعلیں کی کیفیت مت پوچھ
کہ اسکی چھوٹ سے جلتے ہیں آرزو کے چراغ

دلیلِ وادیٔ ہستی ہے نقشِ پا میرا
کہ کھو کے عشق میں پایا ہے میں نے اپنا سراغ

خلیلِ عشق کا ادنےٰ یہ معجزہ ہے شمس
نکل گیا میں جوانی کی آگ سے بیداغ

ادیب سہارنپوری :-

تمام مرحلۂ ناتمام ہو تو سہی
مسافرِ رہِ ہستی کی شام ہو تو سہی

یہ شورِ دیر و حرم، اس کے بعد دیکھیں گے
حکایتِ نگہِ حسن، عام ہو تو سہی

اسی کے بل پہ شکن ہے جبینِ آدم پر
کوئی حریفِ مئے لالہ فام ہو تو سہی

نہیں کہ چارۂ درماندگی نہیں آساں
رہِ حیات میں ممکن قیام ہو تو سہی

بجا کہ غمزۂ ساقی ہے نعمتِ ہستی
مگر کسی کو گوارا یہ جام ہو تو سہی

کسی سے کہنے کو کیا کچھ نہیں ہے دل میں ادیب
کوئی بہانہ برائے کلام ہو تو سہی

کون اس حسرتِ درماں طلبی کو سمجھے
زخمِ دل نام سے مرہم کے ہرا ہوتا ہے

نارسائی میں جو لذت ہے رسائی میں کہاں
کون ہے تم سے جو خواہانِ وفا ہوتا ہے

راز کھلتا ہے یہ محبوب سے چھٹنے پہ ادیب
کہ اندھیروں میں خورشید چھپا ہوتا ہے

درد سعیدی :-

ہاں موت کی آرزو بھی کی ہے!
اک یہ بھی فریبِ زندگی ہے،

کیفیتِ دل یہ ہو گئی ہے،
آنسو ہیں کبھی، کبھی ہنسی ہے

ہے ترکِ وفا کا رنج لیکن
تسکین سی دل کو ہو گئی ہے

کیا ختم ہوا فسانۂ غم،
کچھ اور بھی بات بڑھ گئی ہے

اک رُخ پہ چلا ہے جب زمانہ
رفتار مری بدل گئی ہے

اک وہم سہی ترا تصوّر
کچھ دل کو پناہ تو ملی ہے،

یوں اپنے غموں پہ ہنس رہا ہوں
جیسے کہ مجھے بڑی خوشی ہے

عالم یہ رہا سکوتِ غم کا
برسوں میں کبھی اک آہ کی ہے

جینے کی خوشی، نہ موت کا غم
اے دردؔ یہ کیسی بےحِسی ہے

ہے ترا غم بھی تو اُداس اُداس
کتنا گہرا ہے رنگِ عالمِ یاس

اب یہ عالمِ نگاہِ یاس کا ہے
نہ کوئی خوف ہے، نہ کوئی ہراس

لیکے اُبھرا ہوں ظلمتِ غم سے
اک نئی روشنی، نیا احساس

کچھ یہ آشفتگیِ حال ہے اب
جی رہا ہوں بغیر ہوش و حواس

اپنی ناکامیوں کا رنج نہیں
اپنی درماندگی کا ہے احساس

کام کچھ آ سکی نہ سعیٔ جنوں،
آج بھی ہوں بقیدِ ہوش و حواس

دھڑکنیں دل کی کوئی وہم نہیں
کل کا عالم ہے آج کا احساس

مطبوعات موصولہ

تلنگانہ مصنف :- "سیاح" پبلشرز :- دفتر کمیونسٹ پارٹی سینڈہرسٹ روڈ بمبئی (۴) اس پمفلٹ میں سیاح نے اپنے وہ تجربات قلمبند کئے ہوئے جو تلنگانہ کے دوران سیاحت میں ان کو حاصل ہوئے۔

اس وقت تلنگانہ کمیونسٹ جماعت کا بڑا مرکز ہے، جس کے والنٹریوں کو دلم کہتے ہیں اور اسی کی تشکیل کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ تلنگانہ سے مراد زیادہ تر حیدرآباد کا وہ علاقہ ہے جو ضلع ورنگل سے تعلق رکھتا ہے اور جہاں کے کمیونسٹوں سے حیدرآباد اور حکومت ہند دونوں اس وقت برسرپیکار ہیں۔

اس پمفلٹ میں بتایا گیا ہے کہ دلم جماعت کی تنظیم محض جاگیرداروں کے مظالم کا نتیجہ ہے اور وہ اب نہایت منظم طور پر حکومت کا مقابلہ کر رہی ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے اور اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ اب کیا ہے اور آیندہ کن کن مزید انقلابات کا سامنا ہندوستان کو کرنا ہے۔

نیا چین اینا لوئی اسٹرانگ کی کتاب Dawn out here کے بعض حصوں کا ترجمہ کلیم اللہ صاحب نے اس نام سے اردو میں کیا ہے اور قومی دارالاشاعت سینڈہرسٹ روڈ بمبئی ۴ نے شایع کیا ہے۔

اینا لوئی بارہا چین جا چکی ہیں اور انھوں نے وہاں کی موجودہ زندگی کا غایر مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کمیونسٹ تحریک چین میں کیوں اور کس طرح رائج ہوئی اور وہاں کے کسان، مزدور اور عوام کس درجہ اس تحریک سے متاثر ہیں۔

چین، ہندوستان کا ہمسایہ ملک ہے اور یقیناً وہاں کی سیاست کا اثر یہاں پڑنا چاہئے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیں اور وہاں کے حالات سے باخبر رہیں۔ چین کی دوعملی اب ختم ہو رہی ہے اور وہاں کمیونسٹ حکومت کا برسرِ اقتدار آنا لازم ہے، لیکن اس انقلاب کے کیا معنی ہیں اور عوام میں کیوں یہ تحریک اس قدر مقبول ہے، اس کا صحیح علم وہاں کے صحیح حالات کے مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ لوگ جو ہندوستان کے مستقبل سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ اس کتاب کے مطالعہ سے بعض معنی خیز نتائج تک پہونچ سکیں گے۔ قیمت ایک روپیہ۔

تنقیدی نظریے اس کے مولف میر احمد علی خاں صاحب ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے عہد حاضر کے مشہور اہل قلم و اہل رائے حضرات کی وہ رائیں یکجا کر دی ہے جو فن نقد سے تعلق رکھتی ہیں، انھوں نے

اس کو متعدد ابواب میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر باب کا ایک عنوان قایم کر کے اس سے متعلق مشاہیر کے اقوال نقل کر دئے ہیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی رائے بھی ہر باب کے اخیر میں درج کر دی ہے جو بجائے خود بہت اہم ہے۔

قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ :- دکن اُردو اکاڈیمی کالی کمان - حیدر آباد دکن -

نظامی بدایونی

اُردو کی صحافتی دُنیا میں کون شخص ہے جو جناب نظامی بدایونی کے نام سے واقف نہیں۔ انھوں نے سنہ ۱۹۰۳ء میں ذوالقرنین جاری کیا اور اس کی وساطت سے ملک و قوم کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے نظامی پریس قایم کر کے متعدد مفید کتابیں بھی شایع کیں اور آخر عمر تک وہ اپنے فرایض سے غافل نہ رہے۔

اس کتاب میں انھیں کے سوانح محمد احمد صاحب کاظمی نے یکجا کر دئے ہیں، جن کے مطالعہ سے ہم کو نہ صرف مرحوم کی بلند شخصیت کا حال معلوم ہوتا ہے بلکہ پچھلے ۵۰ سال کے بہت سے ایسے واقعات و حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے جن کا تعلق مسلمانوں کی علمی و سیاسی تحریکات سے تھا، قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- نظامی پریس بدایوں۔

سازِ نو

جناب مجاز کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جسے کتابی دنیا لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ مجاز اس وقت کے شاعروں میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ باوجود ترقی پسند ہونے کے شعری ٹکنک میں وہ انھیں اصول کے پابند ہیں جن کی پابندی ہمارے پچھلے شاعروں نے کی تھی اور ان کی شاعری کا پس منظر بھی وہی ہے جس نے ہمارے ذوق شعری کو ایک مخصوص جمالیاتی رنگ بخشا تھا۔

مجاز کی نظمیں ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں، اس لئے ان کے متعلق کسی مزید تقریظ یا تعارف کی ضرورت نہیں۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔

تصوف کی اصلیت

رسالہ ہے مولوی وحید احمد صاحب بدایونی کا لکھا ہوا جس میں تصوف کی حقیقت، اور اس کے نشوونما پر تاریخی و فلسفیانہ حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے تصوف کی پیدائش کے اسباب اور اس کے پس منظر کو واضح کرنے کے لئے پہلے بڑی دلچسپ بحث یہ کی ہے کہ اسلام میں مختلف فرقوں کے پیدا ہونے کے کیا اسباب تھے اور پھر ثابت کیا ہے کہ اس اختلاف کا قدرتی نتیجہ تصوف کا نشوونما تھا جس کی ابتدا انھوں نے دوسری صدی ہجری سے ظاہر کی ہے۔

انھوں نے نہایت خوبی سے اس عام خیال کو رد کیا ہے کہ اسلام میں تصوف ہندو ویدانت اور عیسوی رہبانیت سے لیا گیا ہے۔ زبان، انداز بیان اور طرزِ استدلال کے لحاظ سے رسالہ بہت دلچسپ و مفید ہے۔

قیمت ۱۲ار - ملنے کا پتہ :- فرید احمد صاحب ۲/ - ہیولاک روڈ لکھنؤ

فانی

فانی بدایونی (مرحوم) کے سوانح حیات اور کلام پر تبصرہ ہے، جناب دیبی پرشاد سریواستو (ام. اے منشی کامل) کے قلم سے جسے کتابستان الہ آباد نے شایع کیا ہے۔

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ سوانح حیات کے لئے وقف ہے اور دوسرے میں ان کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے - جس حد تک فانی کے سوانح زندگی کا تعلق ہے - اس میں وہ سب کچھ درج ہے جو اس وقت مختلف رسایل میں شایع ہو چکا ہے - اور سریواستو صاحب شاید اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہ کر سکتے تھے - لیکن کتاب کے دوسرے حصہ میں فاضل مصنف نے بہت کچھ اپنے ذاتی تاثرات سے بھی کام لیا ہے اور نقد و تبصرہ کے اصول کی پوری پابندی کی ہے -

فانی غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ رکھتے تھے اور ان کی حزنیہ شاعری میں جو تلخیِ غم پائی جاتی تھی وہ یقیناً میر کی دل برشتگی سے علحدہ تھی، اسی طرح ان کی غزل کا ٹکنک بھی میر کے انداز سے بالکل جدا تھا - فانی میں میر، مومن، غالب سبھی کا کچھ نہ کچھ رنگ پایا جاتا تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ ان سب سے علحدہ تھے اور اس لئے ان کی داستانِ غم میں ہم کو بہت سے ایسے ٹکڑے بھی ملتے ہیں جو نیشِ غم کو بھی ہمارے لئے گوارا بنا دیتے ہیں نہ اس لئے کہ سوال ناگزیری کا ہے بلکہ محض اس لئے کہ اس کی تعبیریں دلچسپ ہیں -

فاضل مصنف نے اس کتاب میں فانی کی شاعری کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان کے فلسفۂ غم پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے غایر مطالعہ اور کافی اثر پذیری کے بعد لکھا ہے اور وہ بڑی حد تک فانی کے سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں -

ضخامت ۱۸۵ صفحات - قیمت تین روپیہ چار آنے - ملنے کا پتہ :- کتابستان الہ آباد یا کراچی -

تیر نیمکش مجموعہ ہے جناب بزمی بریلوی کی نظموں، غزلوں او قطعوں کا - کتاب میں مسیح الرحمان صاحب کا مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے بزمی کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے -

کلام صاف ہے اور جذبات و تاثرات کی بھی کمی نہیں - پختگی چونکہ کافی مشق چاہتی ہے اور بزمی ابھی نوجوان ہیں اس لئے اس چیز کی جستجو بیکار ہے -

سلک گوہر میر انشاء اللہ خاں کی ایک بے نقط مثنوی ہے، جس کا نام تذکروں میں تو دیکھنے میں آتا تھا لیکن وہ خود نگاہوں سے اوجھل تھی - یہ نسخہ رامپور کے کتاب خانہ کے علاوہ کہیں اور موجود نہ تھا اسلئے مولینا امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتاب خانہ رامپور نے اس کو شایع کر کے ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے - کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور کتاب خانہ رامپور کے پتہ سے مل سکتی ہے -

مسلم دیش بھگت یہ کتاب ہندوستانی کلچر سوسائٹی الہ آباد نے شایع کی ہے اور رتن لال بنسل فیروزآبادی نے لکھی ہے - اس میں پندرہ ان بڑے بڑے مسلمانوں کے حالات لکھے گئے ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی طرح ملک کی خدمت کی ہے - پہلا نام شاہ ولی اللہ کا ہے اور اس کے بعد شاہ عبدالعزیز، حاجی امداد اللہ مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ کا اور آخر میں بریگیڈیر محمد عثمان کا -

یہ کتاب ہندو مسلم اتحاد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور اس ہندستانی زبان میں لکھی گئی ہے جس کو یہ سوسائٹی رواج دینا چاہتی ہے۔ مقصد کے لحاظ سے یہ کتاب یقیناً بہت بلند ہے اور ضرورت ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک ہی مرکز پر لانے کے لئے ایسی کتابیں کثرت سے لکھی جائیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی زبان کے طرفداروں کے لئے بھی اسکا مطالعہ فایدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس میں ہم کو بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جنھیں ہم بہت آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔ حجم ۱۰۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

آج کے شہید

یہ کتاب بھی ہندوستانی کلچر سوسائٹی الہ آباد نے شایع کی ہے۔ اس کے مصنف رتن لال بنسل ہیں۔ اس میں ان بارہ ہندو مسلمانوں کی خدمتوں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے پچھلے فسادوں میں لوگوں کی جان بچائی اور خود مارے گئے۔ پہلا نام شری گنیش ودیارتھی کا ہے اور آخری شعیب اللہ خاں حیدرآبادی کا۔ اس کتاب کا مقصد بھی مذہبی تفریق کو مٹا کر انسانیت پرستی کی تعلیم دینا ہے۔ حجم ۱۴۶ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

تم بڑی سنگدل ہو

عزیز النساء حبیبی بی۔ اس سی (عثمانیہ) کے افسانوں کا مجموعہ ہے جسے فاضل فیضی مارٹ عابد شاپ حیدرآباد نے شایع کیا ہے۔ ابراہیم جلیس کا لکھا ہوا مقدمہ بھی اس میں شامل ہے، جس میں انھوں نے دل کھول کر داد دی ہے۔ ہر چند عزیز النساء کے ان تحریروں کو نہ ہم افسانہ کہہ سکتے ہیں نہ کہانی، لیکن ان کے دلچسپ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ نسائی کیفیات جن کا تعلق جنسی جذبات سے ہے۔ اسی وقت صحیح ادب کا سرمایہ بن سکتی ہیں جب ان کے اظہار میں خاص سلیقہ و احتیاط سے کام لیا جائے اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عزیز النساء اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ انھوں نے زن و شو کے مسایل میں اپنی جنس کی بڑی اچھی نمایندگی کی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے۔ ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔
معجون عنبری
یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اس کے مداح موجود ہیں۔
دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمائیے، اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے
قیمت فی شیشی ۴۰ خوراک چار روپیہ (للعہ)
(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے۔
میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۳۰ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔
پتہ:- حکیم ثابت علی پنج زبان، خوش کلام
(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

باب چہارم

(۱) **میر انیس کا شاعرانہ ادراک** ۔ اس وقت تک ہم نے صرف اس بات کے واضح کرنے کی کوشش کی کہ مرثیوں میں میر انیس نے کیا کیا موضوع اختیار کئے اس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے اور ان کی شاعری کو یورپ کی شاعری کے بعض اصناف مثلاً ڈرامہ اور ایپک سے مقابلہ کر کے ان کی بابت کیا کیا رائیں قایم کی گئیں۔ اب ہم کو مراثی کی فنی حیثیت پر نظر ڈالنا ہے اور اس سلسلہ میں اب ہم ان کے مرثیوں کی وہ خصوصیات بتائیں گے جن کو اب تک لوگ نظر انداز کرتے رہے حالانکہ ان کی اہمیت اس قدر ہے کہ اگر انیس کے مراثی کو کسی طرح دائمی زندگی حاصل ہو سکتی ہے تو انھیں خصوصیات کی بنا پر۔ میر انیس کی حیثیت مفکر اور محقق کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں ہے مگر فنکار کی حیثیت سے بہت بلند ہے۔ ہر چند ان کے فن کا دائرہ نہایت محدود تھا، لیکن اس محدود دائرے میں جس قسم کا فن وجود میں آنا ممکن تھا وہ ان کے یہاں اعلیٰ درجہ پر پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میر انیس کا شاعرانہ ادراک ایک برزخی دور کے شاعر کا ادراک ہے جسے مستقبل کی شاعری کا احساس تو ہے لیکن اپنے ماحول اور روایات سے باہر جانے کی ہمت یا اہلیت نہیں رکھتا۔ ہر چند ان کے مرثیوں میں کہیں کہیں ایسے ٹکڑے بھی ہیں جو حقیقت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور ایسی تصویریں بھی ہیں جو خالص مبالغہ نگاری کے مقابلہ میں تو حقیقی معلوم ہوتی ہیں مگر واقعی حقیقت نگاری کے لحاظ سے وہ پھر بھی بہت مبالغہ آمیز ہیں، ہم اسکی تشریح ایک مثال سے کرتے ہیں۔ مرثیہ "طے کر چکا جو منزلِ شب کاروان صبح" میں تلوار کی یہ تعریف کی گئی ہے:۔

بجلی سی تیغ شعلہ فشاں چار سو پھری — میداں میں بھاگتی ہوئی فوجِ عدو پھری
دم میں ستم گروں کا بہا کر لہو پھری — سر کاٹ کر جدھر سے پھری سرخرو پھری

یہ اوج تیغ قدرت حق سے عیاں ہوا
گویا ہلال عید شفق سے عیاں ہوا

غلطاں تھے تن زمیں پہ جدا اور سر جدا — زخمی اُدھر پڑے تھے جدا اور ادھر جدا
گردن جدا تھی سینہ جدا اور سر جدا — شانے سے ہاتھ ہاتھ سے تیغ و سپر جدا

پستی پہ جب چمک کے بلندی سے آتی تھی
گاوِ زمیں زمیں کے تلے تھرتھراتی تھی

رو کا سپر پہ جب تو سپر سے نکل گئی — دو کر کے خود کاسۂ سر سے نکل گئی

آئی ادھر سے گر تو ادھر سے نکل گئی   سینہ کو چاک کر کے کمر سے نکل گئی
ضربت سے چار آئینہ والے بھی دنگ تھے
کہنے کو تھی وہ تیغ پہ بجلی کے رنگ تھے

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان میں حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مبالغہ سے خالی نہیں اور میر انیس کا یہی رنگ ان کا انفرادی رنگ ہے۔ جس میں انھوں نے حقیقت نگاری اور مبالغہ دونوں کو ملا کر پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں ان کو قدرت نے حقیقی شاعر پیدا کیا تھا مگر وہ روایات سے کیسے الگ ہو سکتے تھے، ممکن ہے کہ اگر وہ حقیقت نگاری کی روایات میں پیدا ہوئے ہوتے تو فطری رجحان کی وجہ سے وہ واقعی حقیقت نگار ہوتے، لیکن افسوس ہے کہ ان کی شاعری روایات سے داغدار ہو گئی ہے۔

(۲) **مصوری** - اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے ادراک والا شاعر مرثیہ کے صنف میں کونسی ایسی خصوصیت پیدا کر سکتا تھا جو نہ صرف حقیقی شاعری بلکہ اعلیٰ شاعری کی بھی خصوصیت رکھتی ہو۔ مرثیہ کی رسم مجلس سے وابستگی، ڈرامائی اور ایپک خصوصیات کی ضرور منافی تھیں مگر ایک قسم کی حقیقی شاعری کی یقیناً اس میں گنجایش تھی اور وہ بیانیہ شاعری ہے چنانچہ میر انیس نے بھی بیانیہ شاعری مصوری کی حد تک کی ہے۔ لیکن یہ مصوری بھی ایک خاص ادراک کے ماتحت ہے اور اسی لئے میر انیس کی تصویریں حقیقی فوٹو گراف نہیں بلکہ آرٹ کی تصویریں ہو کر رہ گئی ہیں مثلاً مرثیہ کا مشہور ٹکڑا ہے جس میں میر انیس نے گرمی کی شدت بیان کی ہے :-

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب   کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب   خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں سے چارپائے نہ اٹھتے تھے تابہ شام   مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام   پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثل موم خام
سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اُترا تھا سائے کی چاہ سے

آبِ رواں سے منھ نہ اٹھاتے تھے جانور   جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم بھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر   خس خانۂ مژہ نکلتی نہ تھی نظر،
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

اسی تصویر پر غور کیجئے - گرمی کی شدت سے جو عالم کائنات کی زندہ چیزوں پر طاری ہو گیا اس کی طرف تمام حقیقی اشارے موجود ہیں مگر ہر اشارے کو مبالغہ کے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے جو حقیقی شاعری کے نقطۂ نظر سے یہ یقیناً عیب ہے۔ لیکن اس زمانہ و ماحول کو دیکھتے ہوئے جو انیس کو میسر آیا تھا، ہم ان سے یہ توقع نہ رکھ سکتے تھے کہ وہ ان تمام فنی روایات سے الگ ہو کر شاعری کرتے جن کو اس وقت کی ذہنی فضا کو کسی طرح دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہر فن کے لئے کچھ اصول کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے تحت فن حقیقت سے کچھ نہ کچھ دور ضرور ہو جاتا ہے اور جو خالص فنکار ہیں ان کے یہاں بھی ٹکنیک کے اثر سے تصویر اصلیت سے ضرور کچھ نہ کچھ ہٹ جاتی ہے۔

شاعری ایک ایسا فن ہے جس کو دنیا کے ہر علم و فن سے تعلق ہے مگر ہر شاعر کو ہر علم و فن سے تعلق نہیں ہوتا۔ جس شاعر کو انسان کے باہمی سوشل روابط سے تعلق ہوتا ہے وہ ڈرامائی شاعر ہوتا ہے جس کو فلسفۂ اخلاق سے تعلق ہوتا ہے وہ ایپک شاعر ہوتا ہے، جس کو اپنے خارجی جذبات وغیرہ سے تعلق ہوتا ہے وہ لیرک شاعر ہوتا ہے۔ اسی طرح فن کے لحاظ سے بعض شاعروں کو بتگری سے مناسبت ہوتی ہے بعض کو مصوری سے اور بعض کو موسیقی سے - میر انیس کی طبیعت کا رجحان تمامتر مصوری کی طرف تھا۔ انھوں نے ہر جگہ اپنے تئیں مصور ہی بتایا ہے ہر جگہ مصوروں ہی سے اپنا مقابلہ کیا ہے۔ مانی و بہزاد اور ارژنگ کے عمل کو اپنا عمل قرار دیا ہے - اس لئے ان کو مصور شاعر ہی ماننا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مگر شاعر مصور سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔ مصور کو ہر صوری پہلو سے سروکار ہوتا ہے اور شاعر کو اس کے اثر سے - مثلاً اگر مصور کسی دبلی پتلی لڑکی کا نقشہ کھینچے گا تو اسکی کمر میں خاص قسم کے بل دکھائے گا مگر شاعر یوں تو دکھا نہیں سکتا وہ اس کی نزاکت کا ذکر کرے گا۔ اگر کوئی شخص انکسار سے سر جھکائے تو مصور ہماری توجہ زیادہ تر سر کے جھکاؤ کی طرف لائے گا۔ مگر مصوّر شاعر یوں کہے گا:-

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

میر انیس کی شاعری میں باوجود مبالغہ آمیزی کے ہمکو مصوری کے صحیح اشارے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً یہ تصویر لیجئے۔ حضرت علی اکبر کو زخمی ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے:-

لڑتے تھے کہ پیشانیٔ انور پہ لگا تیر
سب خوں سے بھری احمد مختار کی تصویر
لکھا ہے کمیں میں تھا کوئی ظالم بے پیر
برچھی جو لگی سینہ میں حالت ہوئی تغیر
اللہ رے شجاعت کہ نہ ابرو پہ بل آیا
پھل اس نے جو کھینچا تو کلیجہ نکل آیا

ٹکڑے جو بہے خوں میں ڈریڑوں میں جگر کے
غش ہو گئے سر گردنِ رہوار پہ دھر کے
نزدیک سے پھر وار چلے تیغ و تبر کے
سب پسلیاں کٹ کٹ گئیں ٹکڑے ہوئے سر کے
تلواریں تھیں یا آپ تھے یا سر پہ خدا تھا
جس ہاتھ سے لڑتے تھے وہ پہنچوں سے جدا تھا

اس تصویر میں تمام تر وہی چیزیں ہیں جن کو مصور بھی پیش کرتا۔ پیشانی پر تیر لگنا، خون سے چہرہ کا تر ہو جانا۔ سینہ پہ برچھی لگنا، شجاعت کو ابرو پر بل آنے سے واضح کرنا، گھوڑے کی گردن پہ سر رکھ کر غش ہو جانا۔ پسلیوں کا کٹ کٹ جانا اور سر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا، یہ سب باتیں اسی طرح کی ہیں جو مصور پوری طور پر دکھا سکتا ہے۔ میر انیس نے بھی یہی سب کچھ الفاظ کے ذریعہ سے پیش کیا ہے، اس لئے ہماری رائے یہ ہے کہ میر انیس نہ شیکسپیر کی طرح ڈرامائی شاعر تھے اور نہ ملٹن کی طرح ایپک شاعر بلکہ اسپنسر کی طرح مصور شاعر تھے۔ ان کی تصویروں میں اگر ہم ڈرامائی احساس، زمان و مکان، انفرادیت و نفسیات ڈھونڈھیں گے تو ہم کامیاب نہ ہوں گے۔ اسی طرح اگر ہم ان میں ایپک کی سی فلسفی اخلاقی اور مذہبی گہرائی ڈھونڈھیں گے تو بھی کامیابی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر ان میں ہم لیرک شاعری کا غنائی اثر دیکھنے کی کوشش کریں گے تو بے نتیجہ ہوگی لیکن اگر ہم ان میں ایک بے مثل مصور کی سی عکس کشی اور اس کی جزئیات وغیرہ تلاش کریں گے تو میر انیس کی شاعری ہمارے لئے بہت دلچسپی کا باعث ہوگی۔

اقسام مصوری ــــ میر انیس کی مصوری کے بہت سے اقسام ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

(۱) **بے حس و حرکت اشیاء کی مصوری** ــــ اس کی مثال میں وہ سین ملاحظہ ہو جب امام حسین علیہ السلام حضرت علی اصغر کو ہاتھوں پر لاتے ہیں:۔

لائے حسین ہاتھوں پہ اک طفل شیر خوار　　راوی نے یہ لکھا ہے کہ اس دم بحال زار
مرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وہ گلعذار　　دن کو ہوا قرانِ مہ و مہر آشکار
تھا فرطِ غش سے ننھا سا منکا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھے مٹھیاں منہ تھا کھلا ہوا

ماتھا جھنڈولے بالوں میں ہالے میں جوں قمر　　چھوٹا سا ایک سبز عمامہ تھا زیبِ سر
آنکھیں تو نرگسی پہ نقاہت زیادہ تر　　جتنی بھویں وہ جن پہ تصدق دلِ پدر
سایہ میں دامنِ خلفِ بوتراب کے
رخسار تھے کہ پھول کھلے تھے گلاب کے

خشکیدہ ہونٹ موئے مژہ آنسوؤں سے تر　　پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل اِدھر اُدھر
ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے ہیکل تھی سینے پر　　باچھوں سے تھا نمود جیسے دودھ کا اثر
ننھے سے دل کو ماں سے بچھڑنے کا درد تھا
رن کی ہوائے گرم سے جسم اسکا سرد تھا
رنگیں ہے جن کے وصف میں باغِ سخنوری　　تھے لال لب نگینۂ یاقوتِ احمری

غنچہ کا منہ ہے کیا جو کرے اس سے ہمسری
وہ خار یہ رگِ گُلِ بستانِ حیدری
تھی نازکی میں اس پہ خزاں مارے پیاس کے
تالو سے لگ گئی تھی زباں مارے پیاس کے

کرتا بدن میں آتا تھا اس رنگ سے نظر
پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسے دمِ سحر
سینہ تھا صاف صورت آئینہ جلوہ گر
گرمی سے ہو گیا تھا شلوکہ عرق میں تر
چھاتی میں دمبدم جو دم اس کا اٹکتا تھا
گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دے دے پٹکتا تھا

یہ ایک بے حس و حرکت مجسمہ کی تصویر ہے اور شاعر نے تصویر کے ہر خط و خال اور ہر رنگ و سایہ کو نہایت نزاکت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس تصویر کے آخری حصہ میں صرف ایک جگہ حرکت کی طرف اشارہ ہے ورنہ تمام تصویر ایک شش ماہے بچے کی ہے جو بے حس و حرکت دکھایا گیا ہے۔

مناظر قدرت :- کی تصویریں بھی انیس کے یہاں کافی ہیں اور ان کو بھی بے حس و حرکت تصویروں کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے مگر ان تصویروں میں شاعر نے مبالغہ کا رنگ گہرا کر دیا ہے تاہم ان میں کچھ ایسی خاص باتیں بھی ہیں جو میر انیس سے پہلے کے اُردو شاعروں میں کم ملتی ہیں۔ یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور
وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گُل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گُل وہ نالۂ مرغانِ خوشنوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گُل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

یہاں کسی خاص چمن کی تصویر پیش نہیں کیگئی بلکہ شاعر کے تصور میں وہ تمام چیزیں ہیں جو خوشنما باغوں میں ہوتی ہیں۔ ایسا باغ کربلا کے ریتیلے میدان پر یا دنیا کے پردے پر کہیں ہو سکتا ہے یا نہیں اس سے شاعر کو کوئی غرض نہیں۔ وہ ایک تخئیلی تصویر بنا رہا ہے اور اس میں وہ ہر رنگ بھر رہا ہے جو کسی باغ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس تصویر میں سب کچھ ہے، پھولوں کا رنگ ہوا کی ٹھنڈک، چڑیوں کے چہچہے اور انھیں کو جوڑ کر شاعر نے تصویر بنائی ہے۔

یورپ کے ادب میں مناظر قدرت کو ایک خاص اہمیت یوں حاصل ہو گئی کہ اُنیسویں صدی کی رومانی تحریک جو جرمنی کے روحانی فلسفہ سے بہت کچھ متاثر تھی اس نے قدرت کو وہی ہمہ گیر معنے دئے جو عشق کو ہمارے غزل گویوں نے، ورڈسورتھ کے بعد کے شاعروں میں جو ہمیں مناظر ملتے ہیں ان میں ایک قسم کی پنہاں اشاریت ہے جو فلسفی اور مذہبی قدروں کو ہمارے دھیان میں لاتی ہے، میر انیس فلسفی بالکل نہ تھے وہ محض شاعر تھے اور ان کے ان مناظر میں تاثرات کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔

متحرک تصویریں — شاعر کو مصور پر فوقیت اس طرح بھی حاصل ہے کہ وہ متحرک اشخاص یا چیزوں کی بھی تصویر کھینچ سکتا ہے جبکہ مصور محض سکوت کے عالم کو دکھا سکتا ہے۔ متحرک مناظر کے بیان کرنے میں بھی شاعر کا اُصول مصوری وہی رہتا ہے یعنی یہ کہ وہ بدلتی ہوئی حالت کو بھی اسی طرح واضح کرتا ہے جس طرح مصور۔ مصور اگر کسی دوڑتے ہوئے گھوڑے کی تصویر بنائے گا تو گھوڑے کے جسم کے حصّوں کو ان حالتوں میں دکھائے گا جن سے حرکت کا اندازہ ہو سکے۔ میر انیس نے بھی گھوڑے کی حرکات کو اسی طرح واضح کیا ہے۔ ان کے یہاں گھوڑے کی تعریفوں میں اکثر ایسے ٹکڑے بھی ملتے ہیں جسمیں گھوڑے کے اعضا کی حرکت پر زور دیا گیا ہے اور جس سے چال کی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً:-

دو دن سے بے زبان پہ جو تھا آب و دانہ بند دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

یا اس تصویر کو لیجئے جس میں گھوڑے کی چال کو واضح کیا گیا ہے:-

سمٹا، جما، اُڑا ادھر آیا اُدھر گیا چمکا پھرا جمال دکھایا ٹھہر گیا

تیروں سے اُڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اسکے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

پھرتا تھا کیا صفوں میں جری جھوم جھوم کے سرعت بلائیں لیتی تھی منھ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے غل تھا یہ غول میں پسر سعد شوم کے
رخش ایسا روم و رے میں نہیں شام میں نہیں
یہ شوخیاں تو ابلقِ ایام میں نہیں

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال کبک دری خجل دل طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوا بھی گرد تھا

اسی طرح تلوار کی کاٹ کے سلسلہ میں بھی اکثر ایسے مرقعے ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں بدلتی ہوئی حالت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ حضرت عباس کے سلسلہ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کی ایک نہایت عمدہ محرک تصویر بن سکتی تھی، مگر روایات اور مرثیہ کے رسوم نے انیس کو ہر جگہ اس بات پر مجبور کیا کہ حضرت عباس کے میدان میں آتے ہی گھوڑے اور تلوار کی تعریف کی طرف متوجہ ہو جائیں، پھر بھی بعض جگہ اس رسم سے الگ ہو کر ہمارے سامنے ایک لڑائی کی متحرک تصویر پیش کرنے میں وہ بہت کامیاب ہوئے ہیں۔

پڑھ کر یہ رجز میان سے لی تیغ جری نے جلوہ کیا پردے سے نکلتے ہی پری نے
رہوار پر اسپند کیا کبک دری نے، بوسہ دیا قدموں پہ نسیم سحری نے
اُڑ کر گیا اور بھرکے طرارہ نکل آیا
تلواروں کے جنگل سے چکارہ نکل آیا

گھوڑے کو ادھر سے جو پلٹ کر ادھر آئے یوں آئے کہ روباہوں میں جوں شیر نر آئے
گویا کہ علی لشکر ہیجا میں در آئے سر خاک پہ گرتے ہوئے بے سر نظر آئے
تلوار کی بجلی جو گری کوند کے رن میں
آخر صف اول ہوئی اک چشم زدن میں
اس صف سے جھپٹ کر صف ثانی پہ جب آئے معلوم ہوا شیر کے پنجے میں سب آئے

غل پڑ گیا بھاگو کہ امیرِ عرب آئے　　　　کیا ہوسکے جب فرق پہ برقِ غضب آئے
جھونکا جو چلا صرصرِ شمشیر کا سن سے
ڈھالیں تو اٹھی رہ گئیں سر اڑ گیا تن سے

اس مرثیہ میں آگے چل کر قصیدہ کا رنگ غالب ہوجاتا ہے لیکن میر انیس کی فطرت ان کو پھر عکس کشی کی طرف لیجاتی ہے اور فرماتے ہیں:۔

شمشیر علمدار کی تیزی کا بیاں ہے　　　　بیتیں ہیں دو پارا کہ قلم سیف زباں ہے
ڈھالوں کو سمجھتی تھی وہ بجلی کہ دھواں ہے　　　　چار آئینہ کیا، یہ مہ نو ہے وہ کتاں ہے
کیا قبضہ سے اس برقِ جہاں سیر کے نکلے
فولاد کا دریا ہو تو وہ پیر کے نکلے

حالات کی تصویر ۔ میر انیس کے یہاں بعض ایسی تصویریں بھی ہیں جن سے کسی فرد کی خاص حالت سامنے آجاتی ہے مثلاً امام حسین علیہ السلام دھوپ میں کھڑے ہیں اور شدت کے ساتھ پیاسے ہیں:۔

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ امم　　　　نے دامنِ رسول تھا نے سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اُٹھتے تھے دم بدم　　　　اودے تھے لب زبان پہ کانٹے کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات پہ لکنت زبان کو

گھوڑوں کو اپنے کرتے تھے سیراب سب سوار　　　　آتے تھے اونٹ گھاٹ پہ باندھے ہوئے قطار
پیتے تھے آبِ نہر پرند آکے بے شمار　　　　سقے زمیں پہ کرتے تھے چھڑکاؤ بار بار
پانی کا ام وُد کو پلانا ثواب تھا
اک ابن فاطمہ کے لئے قحطِ آب تھا

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر　　　　خادم کھڑے تھے مروحہ جنباں اِدھر اُدھر
کرتے تھے آب پاش مکرر زمیں کو تر　　　　فرزند فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر
وہ دھوپ دشت کی وہ جلال آفتاب کا
سونلا گیا تھا رنگِ مبارک جناب کا

یہ تصویر ایک مظلوم پیاسے کی حالت کو تکمیل کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اسی طرح کی تصویریں وہ بھی ہیں جن میں امام حسینؑ کو مختلف مقامات پر گریہ و زاری کرتے ہوئے یا حضرت زینبؑ کو خیمہ سے نکل کر قتل گاہ کی طرف جاتے دکھایا گیا ہے کہ اگر ہم ان تصویروں کو امام کی عظمت سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو ہم کو اس میں بہت سی مصورانہ نزاکتیں مل سکتی ہیں۔

مکتوبات نیاز تین حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشا میں بالکل نئی چیز ہیں، جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کا غذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ تین روپیہ، حصہ سوم چار روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخییل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادیین کا مذہب۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت:-

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت:-

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے

قیمت حصہ اول للعہ حصہ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیاتِ مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ -

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -

قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۴۶ء

یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فنِ انتقاد پر ملک کے بہترین اہلِ قلم اور اربابِ فکر کے مضامین پر مشتمل ہے پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں۔

قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجدولین نمبر" ہے جس میں ایک مشہور فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا -

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمتِ رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دورِ زرین اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہلِ قلم کے شایع کئے گئے ہیں - اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے - قیمت دو روپیہ - علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۲ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرونِ ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے